

عکس آئینہ ارغودی



ڈاکٹر عصمت جاوید

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

عکسِ اسرارِ خودی

علامہ اقبال کی شہرہ آفاق فارسی مثنوی ”اسرارِ خودی“ کا منظوم ترجمہ

مترجم

ڈاکٹر عصمت جاوید

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ ۹۷۸

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ
© اشاعت اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ ادبی)

عکس اسرار خودی از علامہ اقبال

ڈاکٹر عصمت جاوید

مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۳، چٹلی قبر، دہلی ۷

نام کتاب

مترجم

ناشر

اشاعت :

طبع اول

دوم

جولائی ۱۹۹۱ء

دسمبر ۱۹۹۲ء

۱۱۰۰

۱۱۰۰

قیمت : ۱۴ روپے

AKS-E-ASRAR-E-KHUDI [Urdu]

By Allama Iqbal

Translated by: Dr. Ismat Javed

Price: Rs. 14.00

مطبوعہ

دعوت آفیسٹ پرنٹرز، دہلی ۷

۵۳	۵	۵۲	۵۳
۵۴	۲۱	۵۴	۵۴
۵۹	۲۷	۵۹	۵۹
۶۱	۳۰	۶۱	۶۱
۶۳	۳۲	۶۳	۶۳
۶۵	۳۶	۶۵	۶۵
۶۷	۳۸	۶۷	۶۷
۶۹	۴۰	۶۹	۶۹
۷۲	۴۳	۷۲	۷۲
۷۸	۵۰	۷۸	۷۸
۸۲	۵۰	۸۲	۸۲

پیش لفظ

”اسرار خودی“ علامہ اقبال کی مشہور و معروف مثنوی ہے۔ مثنوی کیا ہے؟ قوم و ملت کے لئے ایک پیام بیداری۔ اس مثنوی کے ہر شعر سے شاعر کے دل کی تڑپ نمایاں ہے۔ اگر کوئی قوم احساسِ خودی سے خالی ہے۔ تو یقین کیجئے کہ ذلت و رسوائی اس کی قسمت بن چکی ہے۔ احساسِ خودی کا فقدان کسی بھی قوم و ملت کے لئے پیغامِ موت سے کم نہیں، وجود اور منشائے وجود کی تکمیل کیلئے خودی کا احساس لازمی ہے۔ اس کے بغیر گرمی حیات ہو یا سوزِ عشق سب ہی کچھ غیر معتبر قرار پاتے ہیں۔ خودی کے اپنے بنیادی تقاضوں کی طرف بھی علامہ نے اس میں نہایت مؤثر انداز میں اشارے کئے ہیں۔

علامہ اقبال کو شاعرِ اسلام، فلسفیِ اسلام، مفکرِ اسلام وغیرہ کے خطابات یاد کیا گیا ہے لیکن ان کے کلام کے مطالعے اور اشعار کی گہرائی سے حیاتِ مشائے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ علامہ پیغمبرانہ دعوت کے نکتہ پس اور دین کے زبردست مزاج شناس تھے۔ اقبال کا فلسفہ خودی دراصل خدا شناسی تک پہنچاتا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ خود شناسی اور خدا شناسی کے بغیر حیات و کائنات کی کوئی بامعنی توجہ ممکن نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ شاعر کے پیغام کو عام کیا جائے اور قوم خوابیدہ کو جگانے کی کوشش مسلسل جاری رکھی جائے۔ مثنوی کی زبان فارسی ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے اس سے استفادہ ممکن نہ تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید جیسے شاعر نے اس مثنوی کا اردو منظوم ترجمہ پیش کر کے ہماری ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے۔ اس منظوم ترجمہ کے پڑھنے سے اصل مثنوی کی سی جلالت اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم کوئی ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ شاید ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب کے علامہ اقبال مرحوم کو خواب میں دیکھا ہو اور ”اسرارِ خودی“ کو نظم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہو پس علامہ مرحوم فوراً راہنی ہو گئے ہوں اور خود اردو نظم میں سناتے گئے ہوں۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اسے ذہن نشین کر لیا ہو اور صبح اٹھ کر حافظہ سے نقل کر دیا ہو۔ شاعر نے علامہ مرحوم کی زبان و بیان، انداز و لہجہ کو

ایتانے کی کامیاب کوشش کی ہے، بہر حال ”عکس اسرارِ خودی“ آپ کے ہاتھوں میں ہے، توقع ہے کہ یہ منظوم ترجمہ اہل ذوق کے حلقہ میں شرفِ قبولیت حاصل کرے گا۔ محمد جاوید اقبال

مینجر مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

برصغیر ہندوستان تاریخ کی معلومات افزا روشنی کے فوکس (Focus) میں مسلمانوں کی آمد کے بعد آیا۔ اس لئے کہ مسلمان کسی تاریخی بگولے کی مانند نہیں بلکہ ایک عالمگیر نظام تہذیب و اقدار کی دعوت کے ساتھ آئے تھے اور ان کے تصورات و نظریات کے مجموعی خدوخال میں ایک ترقی یافتہ جدید تہذیب اور ایک بھرپور تمدن کے نقوش موجود تھے۔ وہ جہاں گئے، انہیں اعلیٰ تر اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی دعوت لے کر گئے۔ ظاہر ہے کہ اس تہذیب کی دعوت کی ابتدائی زبان عربی ہی تھی۔

مشہور ماہر لسانیات مولانا حامد علی خاں لکھتے ہیں اے ”غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے دو دور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک وہ دور جب مسلمان اس برصغیر کے حکمران تھے اور دوسرا وہ دور جب وہ ایک غیر ملکی طاقت کے غلام بن گئے۔ ہندوستان آنے والے ابتدائی قافلوں کی زبان زیادہ تر عربی تھی اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی زبان کافی عرصہ تک عربی رہی۔“

گویا مسلمانوں کے ابتدائی دور کی زبان عربی تھی اور یہ ایک فطری بات تھی اس لئے جہاں جہاں وہ حکمران ہوئے اور وہاں مستقل آباد بھی ہو گئے وہاں کی مقامی بولیاں اپنی غیر ترقی یافتہ صورت میں بتدریج اپنی افادیت کھو کر ختم ہو گئیں اور عربی وہاں کی دفتری اور سرکاری زبان سے شروع ہو کر بالآخر کاروباری اور عوامی زبان بھی بن گئی۔ افریقہ کے بیشتر مسلمان ممالک

جہاں عربی بولی جاتی ہے۔ اسی عمل میں سے گزرے ہیں۔ مصریوں، یونانیوں، مراکش۔ الجزائر اور متعدد دوسرے ممالک جو جزیرہ نما سے عرب سے دور اور باہر ہیں انہیں مراحل سے گزر کر عربی بولنے والے ممالک بن گئے ہیں۔

چنانچہ ابتدائی عربی قافلوں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی زبان کافی عرصہ تک عربی رہی۔ یہاں تک کہ وسط ایشیا اور دیگر علاقوں سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ دوسری زبانیں بالخصوص فارسی اور ترکی بھی ہندوستان میں انہیں کے ذریعے پہنچیں اور سولہویں صدی تک لسانی کشمکش اور اختلاط کے مختلف مراحل سے گزر کر بالآخر سیاسی حالات فیصلہ کن طور پر فارسی کے حق میں ہو گئے۔ پھر سارے مسلم ہند نے فارسی کو اپنا لیا اور وہ یہاں کی سرکاری دفتری زبان بھی بن گئی۔ چنانچہ فارسی تقریباً تین سو سال کے لئے برصغیر ہندوستان کی سب سے اہم علمی زبان رہی۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تصنیف و تالیف کا دینی کام تو عربی میں ہوتا رہا لیکن ان کے شعر و ادب اور معاشرت کی زبان کے علاوہ دفتری سرکاری زبان فارسی ہو گئی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری جو اسلامی قانون میں حنفی تصور تعبیر کی بہترین کتاب ہے وہ عربی میں تالیف ہوئی اور مکتوبات مجدد الف ثانی جو مجدد صاحب کی اسلامی تحریک احیائے دین کے حوالے سے عام قائدین حکومت اور عوامی معززین کو لکھے گئے مکتوبات ہیں وہ فارسی میں تحریر ہوئے۔ فارسی خط و کتابت تو انگریزوں کی آمد کے بعد بھی برسوں تک جاری رہی اور فارسی زبان کا جائنا اس دور میں ایک شخص کے تسلیم یافتہ ہونے کی دلیل شمار ہوتا رہا۔ علامہ اقبالؒ ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کے آخری دور کے بھی آخری کنائے پر کھڑے ہیں اس لئے ان کا دور لسانی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ابتدائی شعری دور میں انہوں نے فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ان کے خیال میں ان کے افکار و تصورات کی ترجمانی کے لئے اردو کا دامن الفاظ بہت تنگ تھا۔ لیکن اب اردو کا دور شروع ہو چکا تھا اور شعر و ادب کے بیشتر اہل قلم اردو کو ہی ذریعہ اظہار بنا رہے تھے اس لئے اپنی ملت کو مخاطب کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے بھی اردو کو ہی ذریعہ اظہار بنایا چونکہ مسلسل غور و فکر اور اُمت مسلمہ کے مطالعہ حالات کے بعد وہ ایک پیغام کے حامل شاعر بن گئے تھے

اس لئے انہیں اسی زبان کو بالآخر اپنے پیغام کے لئے اختیار کرنا پڑا جسے ان کی ملت کے بیشتر تعلیم یافتہ لوگ سمجھ سکتے تھے۔ بقول ڈاکٹر طبعین الدین عقیل ۱۸۵۷ء اور ۱۹۲۷ء کی تحریک ہائے آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کو یہی زبان کام آئی تھی۔ ”مسلمانوں نے من حیث القوم برصغیر ہند کی متعدد زبانوں میں سے اردو زبان پر ہی قناعت کی اور اسے اپنی پوری متاع سپرد کر کے اپنے خیالات کے اظہار کا بھرپور اور موثر ذریعہ بنایا۔ یہ اس زبان کی اپنی خوبیاں تھیں کہ اس نے بہت جلد ”لنگو فرانسہ“ کا درجہ حاصل کر لیا اور دوسری قوموں کے لئے جہاں ان کا مخاطب عوام سے ہوتا۔ اس زبان کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ اردو نے ہر موقع پر عوامی رابطے کا فریضہ ادا کیا۔ اور آج بھی پورے برصغیر میں رابطہ کی زبان اردو ہی شمار ہوتی ہے۔“ لے

چنانچہ جب فارسی کا دور ختم ہوا اور برصغیر میں بے شمار لائبریریوں میں روزمرہ استفادہ کی عربی فارسی کتب صرف آثار قدیمہ کا مال اور ریسرچ اسکالرز کا موضوع بننے لگیں تو اقبال کے فارسی کلام کو اردو میں دیکھنے اور پڑھنے کا ذوق بھی ترقی کر گیا۔ اقبال کے کلام نے غنیر معمولی انقلابی جذبات پیدا کئے۔ ایک مایوس ملت کو امید افزا مستقبل سے مالا مال کیا اور خاک کی مادی پستی سے اٹھا کر افلاک کی روحانی بلندیوں تک پہنچانے کا عمل سرانجام دیا۔ اقبال کے اس جانفزا عمل نے درد مند دل رکھنے والے اہل قلم کو آمادہ کیا کہ وہ اقبال کے فارسی کلام کو بھی اردو میں منتقل کریں۔ اقبال کی طاقتور ملی شاعری نے اسے دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے رجحان کو جنم دیا یہ عمل اقبال کی زندگی میں ہی بروئے کار آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد تو اس پیغام شاعر کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرنے کا رجحان مزید بڑھ گیا۔ اقبال کا کلام پیغام کا حامل اس لئے قرار پایا کہ اس میں ملت کے مسائل کا شعور موجود ہے۔ ان مسائل کے حل کے واضح خطوط موجود ہیں اور انہیں خطوط کے سبب اس کا کلام مقصدی فن کا حامل شمار ہوتا ہے۔ سید قطب شہیدؒ نے خوب کہا ہے۔

”اسلامی فکر سے ابھرنے والا ادب یا فن مقصدی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام زندگی کو مسلسل آگے بڑھتے رہنے کی تحریک دیتا ہے۔ اسے کسی مخصوص دور میں یا کسی خاص لمحہ میں

لے ”تحریک آزادی میں اردو کا حصہ“ مولفہ ڈاکٹر طبعین الدین عقیل

جو کچھ عملاً پایا جاتا ہے اس پر قانع ہو جانا نہیں آتا۔ اس کا تو کام ہی موجود کو بدلنا اور بہتر بنانا ہے۔ اس کا مستقل پیغام یہ ہے کہ زندگی کی تعمیر نو اور تشکیل جدید کا کام ہر آن جاری رہے۔“ لہ

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اقدار کا شاعر ہے۔ ابدی حقیقتوں کا علمبردار ہے۔ وہ قدریں جو دل و دماغ اور روح میں پرورش پاتی ہیں۔ عقیدے کی سچائیوں سے جنم لیتی ہیں۔ اور بدن کے کپڑوں کی طرح نہ بھٹی ہیں، نہ میلی اور پرانی ہوتی ہیں۔ وہ چاند سورج اور ستاروں کی طرح روشن، بلند اور ابدی وجود رکھتی ہیں۔ نئے اور پرانے کی تقسیم کو اقبال خود دلیل کم نظری قرار دیتا ہے۔

اقبال کا ایک فکری محور ہے جس سے وہ انحراف نہیں کرتا اور اپنے سارے سرمایہ افکار کو اسی لنگر کے ساتھ باندھ کر رکھتا ہے۔ اس صدی کی تاریخ ادب گواہ ہے کہ اقبال نے نصف صدی کے لگ بھگ ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا عظیم الشان کام کیا ہے۔ اس کے فکری سفر میں اسلام کی طرف ایک تدریجی ارتقاء موجود ہے۔ لیکن اس کی تعلیمات کا فکری محور اوّل روز سے آخر دم تک اسلام ہی رہا ہے۔ اقبال اپنے دور میں مسلم ذہن پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہے، وہ آنے والے دور اسلام کا طائر پیش رو ہے۔ وہ یاس و قنوط کا نہیں امید و بیم کا شاعر ہے۔ وہ کم از کم ایک صدی مستقبل کو دیکھنے کی دور بینی نظر رکھتا ہے۔

کسی قوم کی متاع بے بہا مادے کے وہ بھاری بھر کم تو دے نہیں ہوتے، جو اس کی سر زمین کے طول و عرض میں کارخانوں، آبی بند، نہروں، جھیلوں اور مادی ترقیات کے منصوبوں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ وہ عالی دماغ افراد اور ان کے علمی، فکری اور تخلیقی کارنامے ہوتے ہیں جو قوم کے وجود معنوی میں نوبہ نو زندگی کی لہریں بن بن کر دوڑتے اور اسے زندہ و پائندہ رکھتے ہیں۔ معاشی وسائل کا کسی قوم کے وجود ملی میں وہی مقام ہے جو جسم میں پیٹ کا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ فکری تخلیقات کا منبع جسم انسانی میں بلند ترین

مقام پر رکھا گیا ہے۔ اسی حقیقت کے ادراک کے بعد ایک عظیم برطانوی مدیر نے کہا تھا کہ ”ویسٹ برطانوی سلطنت کے مقابلے میں شیکسپیئر کا وجود میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح ہے“ اور اسی احساس کے تحت محمد علی جناح نے بھی ۲۴ مارچ ۱۹۴۵ء کو یوم اقبال پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

”اگر میں مسلمانوں کے نصب العین ”اسلامی ریاست“ کے حصول تک زندہ رہا اور اس وقت مجھے اقبال کی تخلیقات اور مسلم ریاست کی حکمرانی میں سے کسی ایک کو چننے کے لئے کہا گیا تو میں اول الذکر کو ترجیح دوں گا۔“

نوع انسانی میں فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے مختلف مدارج ہیں اور یہ رنگارنگی اور بولسمونی عرفان الہی کے لئے کائنات میں مہیا کردہ نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی ہے۔ انسانوں کی اعلیٰ ترین قسم تو انبیاء ہوتے ہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہدایت و رہنمائی کا واسطہ بنتے ہیں اور پھر اس سے کم لیکن دیگر اقسام انسانی سے برتر مفکرین ہوتے ہیں جو اپنی اعلیٰ فکری صلاحیتوں، شخصی تجربات اور قلبی واردات کے آئینے سے بنی نوع انسان کو بلند پایہ تخلیقات اور ذہنی رہنمائی کا فکری سرمایہ بہم پہنچاتے ہیں لیکن ان دونوں میں بھی ایک عظیم فرق ہے۔ پہلی قسم کو خالق خود مشاہدہ حق کرا دیتا ہے اور وہ اول روز سے ہی اپنے جس مقام بلند پر کھڑے ہوتے ہیں، اپنے آخری دم تک انسانیت کے قافلے کو اسی مقام بلند کی طرف رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی عصری یا مادی تغیر ان کے ذہنی ارتقار کا سہارا نہیں بنتا۔ بلکہ دست قدرت خود دستگیری کرتا ہے اور تاپنے کے لئے آگ تلاش کرتے وقت کو خود قدرت کا ہاتھ تھام کر مشاہدہ حق کے کوہ طور پر لا کھڑا کرتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کا انسان اپنے بہت سے فکری اور ذہنی تجربات خود کرتا اور بتدریج اکتساب و ارتقار کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ نبی اوپر سے ہدایت لے کر نیچے اترتا ہے اور گہری ہوئی انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لئے سہارا دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اول روز سے ہی صحیح ترین مقام بلند اور اپنی آخری منزل پر کھڑا ہوتا ہے لیکن ایک فلسفی اور مفکر تدریجاً اکتسابی ذرائع سے فکری بلندیاں طے کرتا ہے اور اس مقام عالی کی طرف بتدریج چڑھتا رہتا ہے جو تمام بلندیوں سے آگے اور مزید

بلند تر ہے ۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے مدد اس لیکچر میں اس عظیم صوتی کا ذکر کیا ہے، جس نے واقعہ معراج پر تبصرہ کرتے ہوئے حسرت سے کہا تھا ”محمدؐ، انعام الہی سے مشاہدہ حق تک جا پہنچے اور پھر واپس لوٹ آئے ۔ خدا کی قسم اگر میں اس مقام پر پہنچا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا۔“

علامہؒ نے اس روایت سے ایک نئی اور ایک صوتی کا فرق بیان کیا ہے ایک وہ انسان ہے جسے ساری انسانیت کی فکر ہے اور ساری انسانیت کی خاطر وہ اس عظیم اور انتہائی بلند مقام سے واپس عالم انسانیت کی طرف لوٹ آیا ہے ۔ اس لئے کہ اس کی ذات فلاح انسانیت کے مقام عظیم پر قائم ہے ۔

دوسرا وہ انسان ہے جو اس مقام بلند کے لئے شب و روز ریاضت اور سوز و تپش میں مبتلا ہے اور اگر اسے وہ مقام مل جائے تو فلاح ذات میں ہی اس کی ساری کائنات آرزو پوشیدہ ہے ۔ پہلی قسم مخلوق خدا کی ہدایت کا وہ فریضہ ادا کرتی ہے، جو خالق کائنات کا اپنا کام ہے جو ان کے واسطے سے ہی انجام پاتا ہے ۔ گویا انبیاء کا گروہ انسانوں میں ہدایت تقسیم کرتا ہے اور دوسرا گروہ خود ہدایت کا متلاشی اور طالب ہے لیکن ہدایت پالینے اور اس کے لئے بھاری ریاضتیں برداشت کر لینے کی صلاحیتیں اس میں بہر حال سب سے زیادہ ہوتی ہیں ۔

البتہ حق و صداقت کی گودیوں پیدا ہو کر بھی اس سے بے شعور رہنا ایک عامی کا مقام ہے ۔ جس پر ایک عالی دماغ مفکر کبھی مطمئن نہیں ہوتا ۔ وہ حق کی جستجو ہستی کے پورے شعور کے ساتھ کرتا ہے تاکہ وہ اس کے حقیقی وجود سے خود آشنا ہو اور اس کا ادراک اسے اپنے حواس خمسہ کی طرح حاصل ہو جائے ۔ اقبالؒ نے حق کی جستجو میں ایک طویل ذہنی سفر کیا ہے ۔ بعض لوگ اس کے ذہنی سفر کی مختلف منازل کو اپنی کم فہمی سے اس کی حقیقی منزل قرار دے بیٹھتے ہیں اور پھر مختلف غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے اور دوسروں کو بھی ان میں مبتلا کرتے ہیں ۔ بعض لوگ اس کی جستجوئے حق کو اس کا تلون (Inconsistency) قرار دیتے ہیں، حالانکہ جستجو کے مختلف مراحل کو عبور کرنے کے لئے ذہنی مقام کی تبدیلی

ناگزیر ہے یہ تلون نہیں ارتقا ہے ۔

اقبال کا مقصد کی استحکام بلند پایہ کلام اور طاقتور پیغام ہی ایک حساس صاحب شعور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اقبال کے پورے کلام کو سامنے رکھ کر اس سے مستفید ہو ۔ یہی چیز اقبال کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور اگر ڈاکٹر عصمت جاوید جیسی باصلاحیت شخصیت میں یہ جذبہ بیدار ہو جائے تو مقصدی کلام کو اس کے مقصد اور پیغام کے قریب تر پہنچانے کے لئے شعر کا لباس پہننا ان کا فرض بن جاتا ہے ۔ یہی ان کا کمال فن ہے کہ انہوں نے مقصدی کلام کو نثر میں ترجمہ کرنے کی بجائے منظوم پیرائے میں پیش کر کے مقصد پیغام اور لطافت شعر کو یکجا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے ۔

ترجمہ بعض حالات میں تخلیق سے مشکل تر کام ہے ۔ ہر تخلیق اپنا پیرایہ بیان اور الفاظ خود اپنے ساتھ لاتی ہے اس لئے کہ تخلیق کی داخلی قوت الفاظ کو اپنے سانچے میں ڈھالتی چلی جاتی ہے ۔ تخلیق کار اپنے تخیل اور تخلیق کے کامل اظہار میں اس قدر گم ہوتا ہے کہ اسے پیرایہ اظہار اور انتخاب الفاظ کا عمل سرانجام دینے کی مہلت کم ہوتی ہے ۔ چنانچہ وہ فطری انداز میں خود بخود تشکیل پاتے ہیں جس میں تخلیق کار کا شعوری ارادہ بہت کم کام کرتا ہے لیکن ترجمہ اس سے مختلف عمل ہے اس میں تخلیق کار کی داخلی قوت کی امداد شامل نہیں ہوتی اور ایک زبان کے اظہار بیان اور الفاظ کو کسی دوسری زبان کے اجنبی الفاظ اور پیرائے میں لانے کا عمل سرانجام دینا پڑتا ہے یہ داخلی تخلیقی قوت کی امداد کے بغیر خالص ایک فنی اور مشاقی پر مشتمل عمل ہے جو میری رائے میں مشکل تر کام ہے ۔

ترجمہ بلاشبہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے اور جو شخص چیلنج قبول کر کے آگے بڑھتا ہے وہ بڑے دل گردے کا ادیب و شاعر ہوتا ہے ۔ ایک شخص خواہ دونوں زبانوں کا کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو مختلف اور متنوع موضوعات کا ترجمہ یکساں مہارت اور خوبی سے نہیں کر سکتا بلکہ ترجمہ تو ایک طرف اصل مصنف کی فنی استعداد تک پہنچنا بھی دشوار ہوتا ہے ۔ چنانچہ اچھا مترجم وہی ہو سکتا ہے جو مصنف کی شخصی اور ذاتی وحدت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اشتراک رکھتا ہو یا کم از کم کوشش کر کے دونوں شخصیتوں کو مشترک بنا سکتا ہو ۔

عصر جدید میں جتنی اہمیت علامہ اقبال کے فکر و فن کو حاصل ہوئی ہے اتنی کسی اور مفکر اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامہ اقبال کے افکار و اشعار نے پورے عالم انسانیت کو متاثر کیا ہے اور ان کے نظریات سے اختلاف رکھنے والوں نے بھی ان کے شاعرانہ محاسن اور فکر کی گہرائی کو سراہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلام اقبال جہاں انسان کو حسن و جمال، مناظر فطرت اور روحانی سکون سے نوازتا ہے، وہاں زیر دستوں اور محکومی و مقہوری سے ستاتے ہوئے انسانوں کے لئے مشردہ جانفزا بھی ہے۔

عہد اقبال بلا شک و شبہ عالمی تحریکات، جنگ و جدل، آزادی کی طلب اور فکری و نظریاتی تحریکوں سے عبارت رہا ہے۔ علامہ اقبال اس دور کے بدلتے ہوئے ہر لحظہ سے باخبر رہے اور انہوں نے عہدِ رفتہ کی عظمتوں کو بھی پیش نظر رکھا اور آنے والے ستہرے دور کی نشاندہی بھی کی جس کی شہادت ان کی ہر نثری اور شعری تحریر میں مل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں اقبال نسلِ انسانی کے ایک مفکر ہی نہیں ایک مصلح اور نجات دہندہ کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ جیسے کسی مسافر کو شجر سایہ دار مل جائے۔ چنانچہ علامہ اقبال کی عالمی مقبولیت بتاتی ہے کہ جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ۔

در ویشِ خدا مست نہ شرتی ہے نہ غری

گھر میرا نہ دلی نہ صفا ہاں نہ سمرقند

تو کوئی غلط نہ کہا تھا بلکہ اپنے بین الاقوامی مشن کا اظہار کیا تھا۔ علامہ اقبال اس اعتبار سے بے حد خوش نصیب ہیں کہ ان کے کلام و سنوار کا ترجمہ ان کی زندگی میں ہی ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر عصمت جاوید نے اردو ترجمے کے لئے علامہ اقبال کی شہرہ آفاق مثنوی اسرارِ خودی کا انتخاب کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ مثنوی علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کو بیان کرنے کے لئے ان کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے۔ پھر اسی اسرارِ خودی کی لے آگے بڑھ کر ان کے سارے کلام اور فلسفہ زندگی میں رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔ علامہ اقبال کی یہ سب سے پہلی شعری تصنیف ”اسرارِ خودی“ ۱۹۱۵ء میں شائع

ہوتی تھی۔ شائع ہوتے ہی یہ مثنوی برصغیر کے اہل علم و تصوف کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کا سبب ”اسرار خودی“ کا موضوع اور علامہ اقبال کے مجتہدانہ خیالات تھے تاہم اس وقت کسی شخص کو بھی اسے اردو میں منتقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ غالباً اس لئے کہ اس وقت فارسی علمی زبان تھی اور قریب قریب ہر تعلیم یافتہ شخص اسے باسانی سمجھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر نکلس وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ”اسرار خودی“ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہی علامہ اقبال کی کسی تصنیف کا کسی زبان میں پہلا ترجمہ تھا۔ و تراجم اقبال کے اس سلسلے کا آغاز بھی اس کتاب کے ترجمے سے بھی ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

آج اقبال کی نظم و نثر کے تراجم دنیا کی بائیس زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان میں اردو، انگریزی، اطالوی، انڈونیشی، بنگالی، ازبک، تاجیک، بنگالی، پشتو، پنجابی، ترکی، جرمن، چیک، چینی، سندھی، سویڈش، روسی، عربی، فارسی، فرانسیسی، کشمیری اور گجراتی زبانیں بطور خاص شامل ہیں۔ بعض زبانوں میں اقبال کے مکمل مجموعہ ہائے نظم اور بعض میں محض انتخاب شائع کئے گئے ہیں۔

زیر بحث کتاب اس سلسلہ کا ایک حصہ ہے۔ زبان میں اب تک درج ذیل تراجم ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

① اسرار و رموز از عبد الرشید فاضل و کتب شادانی ۱۹۷۶ء

شائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور

② ترجمان اسرار از جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن

شائع کردہ مکتبہ کارواں۔ لاہور

③ اسرار اقبال از حسین مہدی رضوی

شائع کردہ عاصم بہاری پبلیکیشنز۔ مراد آباد

④ ترجمان اقبال از نظیر لدھیانوی

شائع کردہ مکتبہ کارواں کچہری روڈ۔ لاہور

اس میں شک نہیں کہ منظوم ترجمہ مشکل ترین اصناف سخن میں سے ہے۔ اس میں بسا اوقات کہنہ مشق

اور قادر الکلام اہل قلم بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو یہی وجہ ہے کہ مترجم بعض اوقات داد کی بجائے بیداد کا نشانہ بن جاتے ہیں ترجمہ فی الحقیقت ایک سعی نامشکور ہے لیکن میں یہ لکھتے ہوئے باک محسوس نہیں کرتا کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اس سعی نامشکور کو سعی مشکور بنا دیا ہے اور فارسی سے نابلد اردو داں قارئین اسے پڑھتے ہوئے ترجمہ کی خشکی کی بجائے تخلیق کی سرسبز اور روح پرور فضا میں اپنے آپ کو محسوس کریں گے اور اگر وہ علامہ اقبال کے فارسی کلام سے اس منظوم ترجمے کا موازنہ کرنے کی یوزیشن میں ہوں تو وہ بے اختیار کہیں گے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اس ترجمے میں علامہ کی تخلیق کے قدم بقدم چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علامہ جس خونِ جگر، اور نفسِ گرم کو تخلیق کا جو ہر قرار دیتے ہیں۔

سے رنگ ہو یا نشتِ دسنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

اسرارِ خودی کے مترجم ڈاکٹر عصمت جاوید کو یہ کیفیت حاصل ہے اسی لئے ان کے ترجمے نے تخلیق کا ردِ پ دھار لیا ہے۔

اسرارِ خودی کے ایک دوسرے مترجم عبدالرشید فاضل نے جو اس کٹھن گھائی میں سے گزرے ہیں ان الفاظ میں اس راہ کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

”فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کرنا اور پھر نظم کا نظم میں اس لئے بھی بے حد مشکل ہے کہ فارسی کا ایک فقرہ بھی کبھی کبھی ایک پوری عبارت کا مضمون ادا کر جاتا ہے۔ ایک مصرع میں بعض اوقات معانی و مطالب کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ اردو میں یہ بات کہاں اس کے علاوہ فارسی زبان کی شیرینی اور خیالاتِ عالیہ کو بیان کرنے کی قابلیت بھی ایک مسلم امر ہے“ لے

موازنے کے لئے اب ہم مترجمین اسرار کے تراجم کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ آغاز کتاب میں تمہید کے چند اشعار یہ ہیں۔

اقبال - (فارسی)

راہِ شبِ چوں مسیرِ عالمِ تاب زد
اشکِ من از چشمِ نرگس خوابِ شُست
نغمہٗ من بر رخِ گلِ آب زد
سبزہ از ہنگامِ ام بیدار رُست
باغباں روزے کلامِ آزمود
جسٹشِ رُحمن (اردو ترجمہ)

متاعِ شب کو لوٹا جس گھڑی سورج کی کرنوں نے
دے پھینٹے رخِ گل پر چمن میں میرے اشکوں نے
جگایا چشمِ نرگس کو مری آنکھوں نے رور و کر
میرے زورِ سخن کی باغباں نے آزمائش کی
اُگا سبزہ میری آواز سے بیدار ہو ہو کر
جہاں مصرعِ مرا بویا دہاں شمشیرِ آگ آئی
اردو ترجمہ حسین مہدی

لٹ گئے عجب لیلیٰ شب کے گہر
میرے آنسو خوابِ نرگس لے اڑے
میرے ہی زورِ سخن سے باغباں
اردو ترجمہ عبدالرشید قاضی
میرے اشکوں سے ہوئے گلِ خوب تر
جاگ اٹھا سبزہ مری مزید سے
بوسے مصرع لے گیا تینغیاں

کاروانِ شب جو لوٹا مہرِ عالمِ تاب نے
چشمِ نرگس سے میرے اشکوں نے دھویا خواب کو
اور کہا سبزے سے نالوں نے کہ اب بیدار ہو

باغباں نے آزمایا جب مرا زورِ کلام
اردو ترجمہ نظیر لدھیانوی
بویا اک مصرعِ عالی حاصل میں تیغِ سبز خام

شب گئی پیدا ہوئی تابِ سحر
میرے ہنگاموں سے نرگس جاگ اٹھی
سبزہ تازہ میرے آنسو سے ہوا
کیا دکھایا ہے اثرِ گفتار کا
میرے نالوں سے کھلا بابِ سحر
باغ کی خوابیدہ مجلس جاگ اٹھی
پھولِ عطر آگئیں میری بو سے ہوا
کامِ مصرع سے لینا تلوار کا

مار کر شبِ خوں جو نکلا آفتاب کھل اٹھے اشکِ مسرت سے گلاب
 خوابِ رخصتِ چشمِ نرگس سے ہوا میرے نغمے سن کے سبزہ جاگ اٹھا
 میں لٹاتا ہوں زر گل بے دریغ شہرِ بو کر کاٹتا ہوں فصلِ تیغ
 میرے سامنے ان پانچوں مترجمین کے منظوم ترجمے پڑے ہیں۔ اگر مجھے دیباچہ کی بجائے
 کوئی مقالہ لکھنا ہوتا تو میں موازنے کے لئے جا بجا منظوم ترجمے کے نمونے دے کر بتاتا کہ ڈاکٹر
 عصمت جاوید کا ترجمہ فی الحقیقت علامہ کے اشعار اور مفہوم و مطالب کی بہترین اور قریب
 ترین منظوم ترجمانی ہے۔ انہوں نے اپنے اس ترجمے میں دیر آید درست آید کی صداقت
 کو اپنے اس ترجمے میں بہترین انداز میں منعکس کر دیا ہے۔ سادگی بیان علامہ کے مفہوم
 سے قربت روائی اور سلاست کے ساتھ ساتھ مثنوی کی بحر کا با مقصد اہتمام ان کی قابل
 رشک خصوصیت ہے جو اپنے اندر ترجمہ کی بجائے تخلیق کا رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ لیکن
 اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ علامہ اقبال کی اسرارِ خودی کے اب تک کے مشہور ترین اردو
 مترجم خانِ اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی کے منظوم ترجمے اور ڈاکٹر عصمت جاوید کے
 منظوم ترجمے کے موازنے کے لئے اسرارِ خودی کی بعض نظموں کے تین تین ابتدائی اشعار کو
 ساتھ ساتھ پیش کر کے قاری کو موازنے کا موقع فراہم کروں ملاحظہ فرمائیے۔

ساقی نامہ

نظیر لدھیانوی

ساقیا جامِ مے گلِ قدام دے اٹھ دوائے کاوشِ ایام دے
 آبِ شعلہ ریزہ زمزم نثراد ہے گدا بھی اس کا رشکِ کیتباد
 جو تخیل کو کرے ہوشیار تر دیدہ بیدار کو بیدار تر
 ڈاکٹر عصمت جاوید

ساقی دلبر مجھے وہ جام دے غم بھٹلا کر جو مجھے آرام دے
 آبِ زمزم سے بنی ہو یہ شراب جس کے آگے جامِ جم ہو آبِ آب

دیدہ بیدار ہو عشرت گرینہ

جس کو پی کر تیز تر ہونے کی تیز
حیاتِ خودی و تخلیقِ مقاصد

نظیر لدھیانوی

زندگی ہے کارواں، مقصد درا
زندگی کی جاں ہے سوزِ آرزو
تانا بن جائے ترا پیکر مزار

مدعا سے زندگی کی ہے بقا
زندگی کا مدعا ہے جستجو
زندہ رکھ دل میں تمنا کا شرار
ڈاکٹر عصمت جاوید

کارواں کو مدعا بانگ درا
آرزو سے زندگی پابستہ ہے
دور نہ بن جائے گاہِ حیاتِ حجاز

مدعا سے زندگی میں ہے بقا
جستجو سے زندگی وابستہ ہے
آرزو دل میں سدا رکھ برقرار
عشق اور استحکامِ خودی

نظیر لدھیانوی

ہے اسی سے ہم میں سوزِ زندگی
زندہ تر، سوزِ زندہ تر، تابندہ تر
اس کی محفّی قوتوں میں زورِ جوش

نور کا نقطہ ہے یہ نقشِ خودی
عشق کی قوت سے ہے پائندہ تر
عشق سے ہے اس کے جوہر میں خردش
ڈاکٹر عصمت جاوید

خاکِ ہم، وہ ہے شرارِ زندگی
زندہ تر، سوزِ زندہ تر، تابندہ تر
اس کے دل میں ارتقائے ممکنات

نور کا نقطہ بنا ہم میں خودی
عشق کے باعث خودی پائندہ تر
عشق سے ہے اس کے جوہر میں حیات

ان چند مثالوں سے آپ کو دونوں منظوم تراجم میں واضح فرق محسوس ہوا ہوگا۔ اب ہم مثنوی کے آخری عنوان ”دعا“ میں سے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

جناب نظیر لدھیانوی

دل میں پنہاں اور ہم سے دور ہے

اے کہن میں مثل جاں مستور ہے

موت تیری رہ میں محسوس حیات
پھر سے دل کے قصر میں آباد ہو
بختہ تر کر عاشقانِ خُسام کو
تو گراں تر اور ہم نادار ہیں

دور ہم سے کیوں ہے اُنے نزدیک جاں
شمع جاں جلتی ہے تیرے فیض سے
موت بھی ہوتی ہے محسوس حیات
تاکہ تسکینِ دلِ ناشاد ہو
بختہ پھر کر دے مزاجِ غام کو
تو گراں قیمت ہے، ہم نادار ہیں

نغمہ پیرا مجھ سے ہے عود حیات
پھر سے تسکینِ دلِ ناشاد ہو
پھر طلب کر ہم سے تنگ و نام کو
بخت کی بیداد سے لاچار ہیں
ڈاکٹر عصمت جاوید

اے دل آرامِ جہاں، جانِ جہاں
نبض جاں جلتی ہے تیرے فیض سے
راہ میں تیری اے مقصود حیات
پھر ہمارے سینے میں آباد ہو
پھر طلب کر ہم سے تنگ و نام کو
آج ہم رسوا سیر بازار ہیں
اسی دعا کے آخری پانچ شعر ملاحظہ ہوں۔

نظیر لدھیانوی

ایک دانا ایک محرم کے لئے
حرفِ این دآں سے بیگانہ بھی ہو
طرحِ محشر آب و گل میں ڈال دوں
پھر میں اس میں اپنا نظارہ کروں
اس کا بت بھی آپ ہوں آرزو بھی آپ

ہے بھری محفل مگر تنہا ہوں میں
جو ہمیشہ سو مرے دل کے قریب
فکرِ این دآں سے بیگانہ بھی ہو
دل کے آئینے میں اس کو یادوں میں

مضطرب ہوں ایک ہمدم کے لئے
جو خردور بھی ہو دیوانہ بھی ہو
آگ اپنی اس کے دل میں ڈال دوں
تاب دے کر اس کو مہ پارہ کروں
ڈھالوں اپنی خاک سے پیر بھی آپ
ڈاکٹر عصمت جاوید

دیکھ مجھ کو لارہِ صحر ہوں میں
مجھ کو بھی یارب ہواکِ ہما نصیب
ایسا دیوانہ جو نرمانہ بھی ہو
اپنی ہو دے کر اسے پیناؤں میں

پھر مری مٹی سے ایک پیکر بنے جس کا میں ادراجہ مرا آذر بنے

ان اشعار کے مطالعہ سے خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے محفل مترجمین میں اگر اپنے پیش روؤں کے بعد قدم رکھا ہے تو میر محفل بن کر رکھا ہے۔ مضامین کے ترجمہ میں ان کی سلاست اور سادگی تاری کو ترجمہ کی خشک وادی سے تخلیق کی اذقلموں وادی میں لے جاتی ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ شاعر کی فکر کے سرچشمہ سے بلا اکراہ و مزاحمت مستفید ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کی یہی خوبی ہے جو ان کے منظوم ترجمے کو اب تک کئے گئے تراجم میں حاصل محنت قرار دیتی ہے اور اس بات میں تو کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا کہ علامہ اقبال کی فکر کا وہ حصہ جو فارسی میں ہونے کے سبب جدید نسل سے اوجھل ہے اسے اردو کا جامہ پہنا کر قارئین سے روشناس کرانا فارسی جاننے والی نسل کے ذمے ان کے اخلاف کا قرض ہے جو ادا ہونا چاہئے اور خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اس قرض کو احسن طریقے سے ادا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ جو اسلاف اپنے اخلاف کو فارسی سے نابلدہ جانے کی قباحت میں مبتلا ہونے سے نہیں بچاسکے ان پر کم از کم اتنی ذمہ داری تو عائد ہوتی ہے کہ وہ نسل کو علامہ اقبال کی مجموعی فکر سے آشنا کرنے کے لئے اسے اردو کا خوبصورت جامہ پہنائیں۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے یہ جامہ تیار بھی کیا ہے اور بلاشبہ اس کی خوبصورتی اور موزونیت کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اقبال کی فکر کا حقیقی محور بلاشبہ اسلام ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں منشی سراج الدین کے نام اپنے خط میں لکھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کر دوں جس کی اشاعت رسول اکرمؐ کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک جملہ تصور کر لیا ہے اور ان کا یہ خیال ایک حد تک درست بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اپنے منظوم ترجمے ”اسرار خودی“ میں

علامہ اقبال کی اس بامقصد مقدس خواہش کا سب سے زیادہ احترام کیا ہے اسی لئے ان کے منظوم ترجمے نے ایک ایسے خلابار کو پُر کیا ہے جو علامہ کی تخلیق اسرار خودی کا مقصود تھا۔

آحقّر

(ڈاکٹر سید اسعد گیلانی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱

عکسِ اسرارِ خودی

تمہید

نیست در خشک و تر بیشہ من کوتاہی
چو ب ہر نخل کہ منبر نشود دار کتم
نظری تیشاہری

کھل اٹھے اشک مسرت سے گلاب
میرے نغمے سن کے سبزہ جاگ اٹھا
شعر بو کر کاٹتا ہوں فصلِ تیغ
میرے نالے ہیں چمن کا تار و پو
لاکھ صبحیں ہیں مری مٹھی میں بند
رازِ دو عالم کی رکھتی ہے خبر
جو ہیں ناپیدا باسِ خاک میں
ہیں گل اندر شاخِ دامن میں مرے

مار کر شبِ خوں جو نکلا آفتاب
خوابِ رخصتِ چشمِ زر گیس سے ہوا
میں لٹتا ہوں زرِ گل بے دریغ
میرے تخمِ اشک میں جوشِ نموا
ڈالتا ہوں آفتابوں پر مست
خاکِ میری جامِ جم سے پختہ تر
ایسے آہو ہیں مرے فتراک میں
سبزۂ نارسہ گلشن میں مرے

کر کے برہم محفلِ باغ و بہار
 سازِ فطرت ہے مرا نادرِ توار
 اس جہاں میں مہرِ نوزائیدہ ہوں
 رم کریں انجم کہاں مجھ میں وہ آب
 میں ابھی تک بکھر پر آیا نہیں
 پھر وہ کیا جاتے مرارِ قصِ ضیاء
 مجھ سے ناما توں چشمِ ہست و بود
 شبنمِ نو ہوں، برا فگتہ نقاب
 صبحِ خیزوں کا ہے مجھ کو انتظار
 نغمہ ہوں پر بے تیارِ ساز ہوں
 مثلِ یوسف کیا بکوں بازار میں
 اور تہی داماں ہیں یارانِ قدیم
 میرے یاروں کا ہے دریا بے خروش
 دوسرا ہے میرے نغموں کا جہاں
 کہتے شاعر مر کے زندہ ہو گئے
 مر کے وہ زندوں میں پھر سے آئے
 ان کے کہتے کارواں گزرے خموش
 میں ہوں عاشقِ نالہ ہے عادتِ مری
 میں وہ نغمہ، جو نہ سنبھلے ساز سے
 دور میرے زورِ طوقاں سے رہے
 کیا سنبھالے زورِ بے پایاں مرا
 جو کلی کھلتی نہ ہو گلزارِ وار

میں نے چھیڑا ہے رگِ عالم کا تار
 دوستِ نغموں سے مرے نا آشنا
 رسم و آئینِ فلکِ نادیدہ ہوں
 ہے مری فطرت ابھی کم اضطراب
 بن کے لالی کوہ پر چھایا نہیں
 پھر یہ کیا سمجھے مرارِ نگِ حنا
 کانپ اٹھتا ہوں وہ ہے خوفِ نمود
 صبح دم نکلا ہوں، مثلِ آفتاب
 آگ ہوں! آتشِ پرستوں کو پکار
 شاعرِ فردا کی میں آواز ہوں
 ہے زمانہ میرا اندھے غار میں
 طورِ میرا آج بھی مانگے کلیم
 اور مرے قطروں میں ہے دریا کا جوش
 یہ جس اس کارواں کا ہے کہاں؟
 نیند سے ہم کو جگا کر سو گئے
 پھوں بن کر اپنی قبروں پر کھلے
 جیسے اونٹوں کا خرامِ بے خروش
 شورش و ہنگامہ ہے فطرتِ مری
 ساز بھی ٹوٹے مری آواز سے
 کہ دو قطرے سے کہ دریا میں ہے
 بحر کے بس کا نہیں طوقاں مرا
 اُس پہ کیا ریجھے مرا ابر بہار

بجلیاں خوابیدہ میرے دل میں ہیں
دشتِ تو! میں سیلِ اے میرا سلام
ہوں ازل سے محرمِ تابِ حیات
میرا نغمہ سن کے، ذرہ جی اٹھے
اس جہانِ راز میں میرے سوا
سرِ عیشِ جاوداں آ مجھ سے سیکھ

کتنے طوقاں میرے آبِ گل میں ہیں
طور بن کر بڑھ، مری بجلی کو کھٹام
مجھ کو قدرت سے ملا آبِ حیات
بن کے جگنو ہر طرف اڑنے لگے
فاسخِ رازِ زندگی کس نے کیا؟
دین و دنیا ساتھ پانا، مجھ سے سیکھ

بند میں رکھوں لبِ اعجاز کیا

کوئی اپنوں سے چھپائے راز کیا

ساقی دلبر مجھے وہ جام دے
آبِ زمزم سے بنی ہو یہ شراب
جس کو پی کر تیز تر ہو فکِ تیز
کاہ کو جو کوہِ با عظمت کرے
فاک کو جو رفعتِ افلاک دے
جس سے قطرے کو لے دریا کا جوش
جس سے خاموشی میں ہو محشر کا شور
ہاں اے ساقی وہ شرابِ ناب دے
میں کروں بھٹکے ہوؤں کی رہبری
جستجوئے نو کی میں دُھن میں ہلوں
چشمِ اہلِ ذوق کی پستی بنوں
روئی آنکھوں کو گُلِ لالہ کروں
کھوں دوں پھر لے کے نامِ پیرِ روم
جانِ رومی میں دہکتے شعلہ زار

غم بھلا کر جو مجھے آرام دے
جس کے آگے جامِ جم ہو آبِ آب
دیدہ بیدار ہو عشرت گریز
بزدلوں میں شیر کی طاقت بھرے
ذہن کو اندیشہ بے باک دے
ذرہ ناچیز ہو صحرِ بدوش
جس کو پی کر باز پر جھپٹے چکور
جو شبِ اندیشہ کو مہتاب دے
دو غلاموں کو میں ذوقِ سروری
آرزوئے نو کی گرمی سے جلوں
گوشِ عالم میں صدا بن کر رہوں
قیمتِ جنسِ سخن بالا کروں
دفترِ سرِ بستہ رازِ علوم
میں، فروغِ یک نفس، مثلِ شرار

گم ہوئے پروانے کے ہوش و حواس
خاک میں میری غمِ تمسیر ہے
اپنے سورج سے بالآخر جڑ گیا
گوہرِ نایاب جس کی تہہ میں ہیں

اس کے ساغر ہی سے پیتا ہے عِلاَم

لے کے اس کی سانس پیتا ہے عِلاَم

نعرۂ ”یارب“ مجھے بس یاد کرتا
خالی پیمانوں پہ روتا کرتا کبھی
پھر میں سوتے سوتے آخر سو گیا
راقمِ قسراً بحسرت پہلوی
کیوں نہیں پیتا شرابِ نابِ عشق؟
نشرِ آنکھوں پر تو سرِ شیشے پہ مار
پھر جگرِ پاروں کو اشکِ خوں بتا
عام کر دے، مثلِ گل، بوئے کمال
آگ سے ہوتا نہیں کیوں ہمکنار
نالہ خاموش کو باہر نکال
عام کر دے اپنا تو سوزِ نہاں
جام میں اپنے سما جا بن کے جوش
لا کے چور ہے پہ اُس کو توڑ ڈال
کچھ تو سیلی کی سنا تو قیس ہے!
ہائے وہو سے بزم کو آیا دگر
کہہ کے ”قم“ زندوں کو زندہ تر بنا

شمع سوزاں آئی جب خود چل کے پاس
فیضِ پیرِ روم سے اکسیر ہے
میں کہ ڈرہ جب زمیں سے اڑ گیا
بحرِ رومی میں ہوں مثلِ موجِ میں

شب، مرادِ مائلِ شہرِ یاد کرتا
شاکِ دوراں میں ہوتا کرتا کبھی
ان خیالوں میں الجھ کر کھو گیا
خواب میں دیکھا کہ پیرِ معنوی
کہہ رہا ہے مجھ سے اے بیتابِ عشق
دل میں محشر کر بہا دیوانہ وار
قہقہوں کو شورِ شجریوں بنا
کیوں ہے چپ، منہ بند کلیوں کی مثال
ہے سپندِ دل ترا ہنگامہ وار
تو جبرِ کس ہے اپنا سرمایہ اچھاں
آگ سے تیری ہو روشن یہ جہاں
فاش کر اسرارِ پیرِ مے فروش
فکر کے شیشے کی کیسی دیکھ بھال!
وے نیستوں کی خبر تو مثلِ نئے
طرزِ نالہ اک نئی ایجاد کر
بن کے جانِ نو، ہر اک جاں میں سما

طرزِ رفتارِ کہن کو چھوڑ دے
تو درائے کارواں ہے، کچھ تو بول!

جادۂ نو کی طرف رخ موڑ دے
چپ نہ رہ، رازِ دروں اب سب کھول

مثل نے، ڈھلنے لگے سینے میں راگ
دم بخود سب تھے مری آواز سے

سن کے یہ، بھڑکی مری رگ میں راگ
بن کے نغمہ جب میں پھوٹا ساز سے

لے کے اپنے ہاتھ میں سازِ خودی
میں سنانے لگا گیا رازِ خودی

ناقص و بے کار و ناکارہ سا تھا
عالمِ کیت و کم عالمِ بنا
چاند کی رگ رگ میں دیکھا ہے ہو
رازِ ہستی تب کہیں مجھ پر کھلے
میں نے کھولا سِرِ تقویمِ حیات
ملتِ بیضا کا ہوں میں گردِ پا
جس کے نغموں سے جہاں آتش بجاں
رومی و عطار جیسے باکمال
ہوں دھواں، لیکن ہے نسبت آگ سے
رازِ ہستی کھولتا ہے دمِ بدم

نقشِ ہستی میرا اک خاکہ سا تھا
جب ترا شاعشق نے، آدم بنا
نبضِ گردوں کی سنی ہے گفتگو
کتنا رویا ہوں میں انساں کے لیے
میں نے دیکھی کارِ گاہِ ممکنات
چاند اگر چہ ہوں اندھیری رات کا
ملتِ بیضا ہے مشہورِ جہاں
جس کے خرمن میں ہیں دانوں کی مثال
میں نکالوں آگ اپنے راگ سے،
فیضِ فکرِ تیز سے میرا قلم

تاکہ قطرہ ہمسرِ دریا بنے !
ذرہ پھیلے، پھیل کر صحرا بنے !

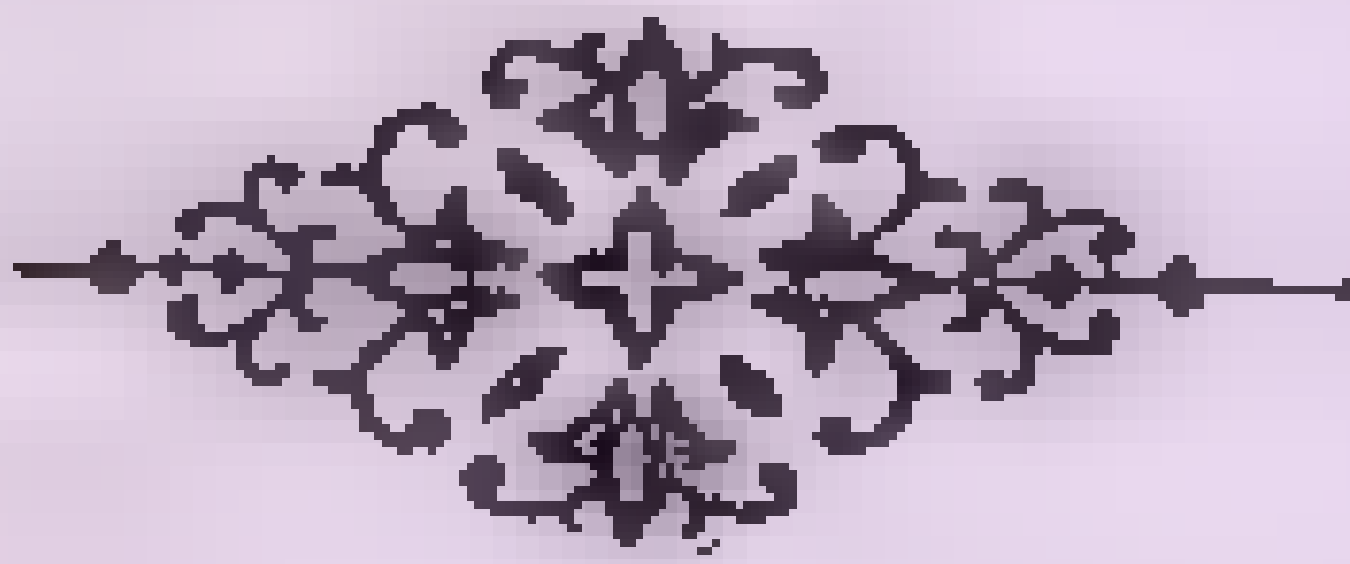
اس کے کب مقصد ہے میرا شاعری

میں نے کی منظوم جو یہ مثنوی

بت پرستی، بت گری میں کیوں کروں
 مثلِ ماہِ نو، تھی پیمانہ ہوں
 توانسار و اصفہاں، مجھ میں نہ ڈھونڈ
 اس سے پیاری ہے زبانِ فارسی
 اس میں نخلِ طور ہے مسیرِ اقلیم
 یہ زبانِ دل مجھے آئی ہے اس

دیکھ اس میں صروتِ جوشِ اندر
 فارسی بولی سے میں بیگانہ ہوں
 حسنِ اندازِ بیاں، مجھ میں نہ ڈھونڈ
 یوں تو ہندی بھی ہے پیاری یارسی
 فارسی میں فنکِ میری شعلہ دم
 رفعتِ اندیشہ کی فطرت شناس

گر ہے پینا، رنگِ مینا سے گزر
 بادۂ مینا پہ رکھ اپنی نظر



(۲)

خودی اور تعینات وجود

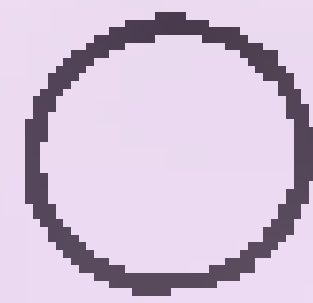
ہیکر ہستی میں ہے جانِ خودی
جب خودی نے پایا اپنا شور
ذات میں اس کی ہے پوشیدہ تفاد
اپنی ہستی کو سمجھ کر ذاتِ غیر
خوش ہے ہیکر ساری اغیار میں
وارا اپنے آپ پر اس نے کیے
خود فریبی کا جتنے وہ تار و پو
اک گل رشک گلستاں کے لیے
سیکڑوں آہ و بکا پیدا کرے
اک فلک اور وہ بنائے سو ہلال
اُس کا یہ اسرافت یہ جنگ و قتال
حسنِ شیریں کا اٹھانے کو خمیر
نافہ مشکیں کی خاطر، دمبدم
سو نہ یہ ہم سے جو ہے پروانہ خوش
نقشِ امروڑ اس نے کتنے روکے

ذرہ ذرہ زیرِ فرمانِ خودی
عالمِ پندار نے پایا ظہور
غیر خود کا اس نے چکھا ہے سواد
اس نے اپنے آپ سے رکھا ہے بیر
جس سے شدت لذتِ پیکار میں
اپنی قوت آزماتے کے لیے
خون سے کرتی ہے، مثلِ گل و ضو
وہ لہو صد ہا گلستاں کا پیہ
تاکہ اک نادر نوا پیدا کرے
ایک نکتہ اور کرے صد قیل و قال
تاکہ ہو تخلیق و تکمیلِ جمال
وہ بہاتی ہے ہزاروں جوتے شیر
آہوؤں کے چاک کرتی ہے شکم
شمع سے کہتی ہے بن پروانہ کش
ایک روشن صبحِ فردا کے لیے

سو خلیلوں کو دیا ہے اس نے داغ
 بنتی ہے خود بہرِ اغراضِ عمل
 کھینچتی کھینچتی، بھگاتی، بھگاتی
 خود ہی قاتل اور خود مقتول ہے
 اس کا میدانِ عمل ہے کائنات
 ہیں اسی کی رات میں گلکاریاں
 اپنے شعلے کو شرر میں بانٹ کر
 خود شکن ایسی کہ اجزا میں بٹی
 منتشر جب تک تھی صحرا دار تھی
 خود کو کرنا فاش ہے خوئے خودی

تاکہ روشن ہو محمدؐ کا چراغ
 عامل و معمول و اسباب و علل
 مارتی، مارتی، جگاتی، جگاتی
 خود ہی رسوا اور خود مقبول ہے
 وہ اگر جاگے تو دن، سوئے تو رات
 ہے غبارِ راہ اس کا آسماں
 دی خرد کو صرف اجزا کی خبر
 اور پریشاں ہو کے صحرا بن گئی
 اور جب سمٹی تو پھر کھار تھی
 ذرے میں قوت ہے از روئے خودی

ایک قوت جو ہے بیتابِ عمل
 اور عمل بھی زیرِ اسبابِ عمل



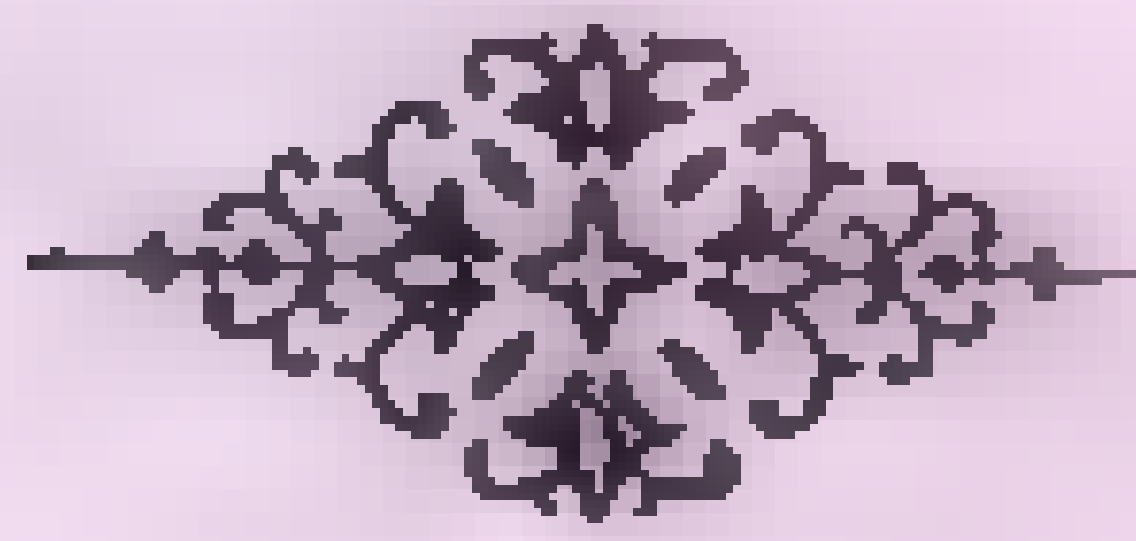
زندگی میں چونکہ ہے زورِ خودی
 قطرہ جب حرفِ خودی از بر کرے
 چونکہ ہے ضعفِ خودی کا ہے شکار
 گرچہ پیکرِ یافتہ ہے جامِ سے
 خود کو تھج کر کوہ جب صحرا بنے
 موج جب تک خود کو رکھے برقرار
 حلقہ زن ہو کر بنا جب نور آنکھ
 پہلے دیدِ جلوہ کی خواہش ملی
 جو نہی آئی سبزے میں اُگنے کی تاب

ہے بقدرِ استواری، زندگی
 ہستی بے مایہ کو گوہر کرے
 جام سے لیتی ہے پیکرِ مستعار
 اس کی گردشِ آدمی کے دم سے ہے
 کیا حریفِ جوشِ دریا بنے!
 ہے وہ سینے پر سمندر کے سوار
 دیکھنے پر ہو گئی مامورِ آنکھ
 آنکھ کو پھر قوتِ جنبش ملی
 تھا زمیں کو چیرنے میں کامیاب

وہ رہی خود اپنے پیروں پر کھڑی
 بن کے آنسو اپنی نظروں سے گری
 یوں نہ چھلتا اُس کا چھینی سے جگر
 بوجھ نامِ غیر کا ڈھوتا نہ یوں
 چاند ہے گردِ زمیں محوِ طواف
 کیونکہ سورج سی وہ طاقتور نہیں
 جس سے دو بالا جلال کو ہمار
 تخم گردن کش نئے ہے اس کا وجود

شمع میں جب تک رہا نہ درِ خودی
 جب پگھل کر دور خود سے ہو گئی
 پختگی ہوتی ٹگنے میں اگر
 نام اُس پر غمیر کا ہوتا نہ یوں
 جا نہیں سکتا قوی تر کے خلاف
 گھومتی ہے گردِ سورج کے زمیں
 خیرہ کن ہے کس قدر شانِ چنار
 آگ نے اس کا بُنا ہے تار و پود

جب خودی حاصل کرے نیروئے زیست
 پھیل کر قلم نہ ہو کیوں تیرے زیست؟



حیاتِ خودی اور تخلیقِ مقاصد

کارواں کو 'مدعا بانگِ درا
آرزو سے زندگی پابستہ ہے
ورنہ بن جائے گا جیتے جی مزار
فطرتِ ہر شے امینِ آرزو
آرزو ہی سے مزہ جینے میں ہے
راسمہ دکھلائے وہ ادراک کو
اور حیاتِ دل میں دنیا کی نجات
اس میں کچھ باقی نہ رہ جائے ہو
آرزو ہے موجِ دریائے خودی
دفترِ اعمال کی شیرازہ بند
شعلہ بجے جائے اگر کم سوز ہو
آرزوئے لذتِ دیدار ہے
ناچنے کی خواہش بیدار نے
شوقِ نغمہ خالقِ منقار مکتا
بعد میں اس سے ہوئے نغمے جدا

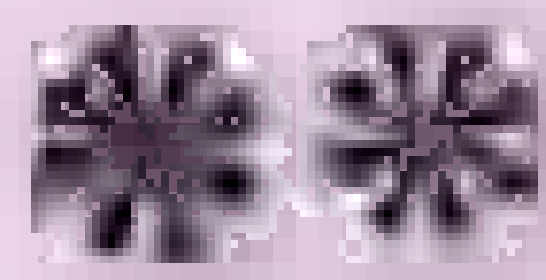
مدعا سے زندگی میں ہے بقا
جستجو سے زندگی وابستہ ہے
آرزو دل میں سدا رکھ برقرار
آرزو جان و جہانِ رنگ و بو
آرزو سے رقصِ دل سینے میں ہے
طاقتِ پرواز بخشے خاک کو
دل میں سوزِ آرزو سے ہے حیات
دل کرے جیسے ہی ترکِ آرزو
آرزو ہنگامہ آرائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد کی کمنہ
اُس سے دوری کیوں نہ مرگِ آموز ہو
یہ جو اپنا دیدہ بیدار ہے
پاؤں بخشے مور کو رفتار نے
پہلے دل بلبل کا نغمہ زار مکتا
نئے، نیستیاں سے ہوئی پہلے جدا

تو نے سمجھا بھی، یہ ہے اعجاز کیا
 آرزو ہے زیست کا روشن دیا
 کیا ہے رازِ تازگیہائے علوم؟
 جو حدودِ دل سے نکلے ہو کے مست
 فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
 جنگ میں اپنے تحفظ کے لیے
 آگہی کو فکرِ نیک و بد نہیں
 علم و فن میں رازِ تقویمِ خودی
 علم و فن ہیں حسانہ زارِ زندگی
 پی مے مقصدِ سدا منحور رہ
 آگ ہے جو ماسوا کے واسطے
 دلربا، دلبر، دل آسا، دل سستا
 باطنِ دیرینہ کے بہت توڑ دے

دیکھ تخلیقِ مقاصد کا اثر

اس سے ہم ہیں زندہ تر، پائندہ تر

عقلِ ندرت کو ش کا ہے راز کیا
 آرزو نے عقل کو پیدا کیا
 کیا ہے نظمِ قوم و آئین و رسوم؟
 آرزوے خود شکن، مشعلِ بدست
 دست و دندان و دماغ و چشم و گوش
 آرزو ہی نے یہ سب پیدا کیے
 علم و فن کا، آگہی مقصد نہیں
 علم و فن سامانِ حفظِ زندگی
 علم و فن سے ہے کشادہ زندگی
 یوں نہ رازِ زندگی سے دور رہ
 ایسا مقصد جس کے راسخ رابطے
 ایسا مقصد جو ہے رشکِ آسماں
 رخ جو سیلابِ بلا کا موڑ دے





عشق اور استحکام خودی

نور کا نقطہ بنا ہم میں خودی
عشق کے باعث خودی پائندہ تر
عشق سے ہے اس کے جوہر میں حیات
عشق سے اس کی طبیعت میں ہے سوز
عشق کو تیغ و سناں سے پاک کیا!
عشق اگر ہے صلح، تو پیکا رہ بھی
عشق کی نظروں سے پھر بھی ہو عشق
عشق کر، اپنے لیے محبوب مانگ
ایک ایسا مردِ کامل ڈھونڈ لے
ڈوب جاؤں عشق طوفاں خیز میں
ہے ترا محبوب خود تجھ میں نہاں
اس کے عاشق خوب سے بھی خوب تر
دل میں، اس کے عشق سے تاب توں
عشق ہی کا فیض تھا کہ خاکِ نجید
قابِ مسلم میں مقامِ مصطفیٰ
خاکِ اُس کی طور کا رکھے بھرم

خاکِ ہم، وہ ہے شرابِ زندگی
زندہ تر، سو زندہ تر، تابندہ تر
اس کے دل میں ارتقائے ممکنات
عشق ہی سے ہے خودی عالم فروز
آب و گل سے وہ نہیں ہے پاک کیا؟
آبِ حیاں بھی ہے وہ تلوار بھی
عشق حق ہے آخر شش سر تا پا حق
چشمِ نوح کو فطرتِ ایوٹ مانگ
کیمیا جو تیسری مٹی کو کرے
روم بھتا جیسے غم تبریز میں
آنکھ رکھتا ہو تو میں کر دوں عیاں
خوشتر و زیبا تر و محبوب تر
خاکِ اس کے عشق سے رشکِ جناں
پل میں پہنچی عرش پر، آیا جو وحید
آبرو ہم سب کی نامِ مصطفیٰ
اس کا گھر کہے کا ہے بیتِ الحرم

ایک ہل اس کا ازل سے تابد
 بوریے پر سوئے وہ عالی تبار
 جو حرا میں حلوئی راز کھتا
 اُس کی آنکھیں رات میں محروم خواب
 تیغ اس کی جنگ میں آہن گداز
 ہر دغا پر کہتی آئیں اُس کی تیغ
 اک نیا آئین دنیا کو دیا
 دین سے کر کے در دنیا کو باز
 اس کا خود تاریخ دیتی ہے ثبوت
 ایک تھے اس کی نظر میں خاص و عام
 دخترِ طے جنگ میں ہو کر اسیر
 شرم سے تھا اس کا پیکر آب آب
 جب نبیؐ نے دیکھی یہ بے پردگی
 آج اُس خاتون سے بے پردہ تر
 کیوں نہ ڈالے اپنی چادر ہم پہ آج
 وجہ رحمت اس کا لطف و قہر تھا
 لے اس گھڑی جب موقعِ تادیب تھا

کون ناپے اُس کی پہنائی کی حد
 اُس کے پیر و تاج کسریٰ لیں اتار
 ہاں وہی انساں حکومت ساز تھا
 تاکہ برپا ہو جہاں میں انقلاب
 اور آنکھیں اس کی نم و وقت نماز
 قاطع نسلِ سلاطین اُس کی تیغ
 طرزِ اقوام کہن کو رد کیا
 کر دیے واہم پہ اس دنیا کے راز
 کب دیا دھرتی نے پھر ایسا پوت
 ساتھ دسترخوان پر ہوتے غلام
 آئی جب پیشِ شہِ گردوں سریر
 پاؤں میں زنجیر اور رخ بے حجاب
 اپنی چادر اس کے سر پر ڈال دی
 ہم کھڑے ہیں پیشِ اقوامِ دگر
 رکھنے والا ہے وہی محشر میں لاج
 دوست دشمن سب کے حق میں مہر تھا
 اس کے لب پر قولِ لا تشریب تھا

۱۔ قبیلہ سُلَیْم کے سردار کا بیٹی۔

۲۔ فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکھوں یَہُودِیَّہ (آج تم سے کوئی باز پرس نہیں) کہہ کر اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا تھا۔ یہی الفاظ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو معاف کرتے

وقت استعمال کیے تھے (دیکھئے سورۃ یوسف آیت ۹۲)

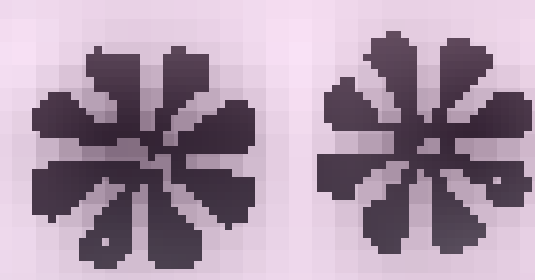
دین میں لے کر وطن سے ہم پناہ
 ہم حجازی بھی ہیں، ایرانی بھی ہیں
 مستِ چشمِ ساقیِ بطحا ہیں ہم
 امتیازاتِ نسب سے پاک ہیں
 ایک یو، والے گلِ صدرِ رنگِ ہم
 ہم کہ اس کے دل میں تھے سرِ نہاں
 اس کا شورِ عشقِ میری نے میں ہے
 ذکرِ اس کا کیوں نہ پھیلے مثلِ مشک
 قلبِ ہر مسلم میں تابشِ اس سے ہے
 آتشِ فرقت وہ اس کی، الاماں
 میں گلستاں، وہ مرا ابر بہار
 منتیں کیں میں نے کتنی یار کی
 حسنِ یثرب پر ہے اک عالمِ نثار
 گرچہ فنِ شعر میں نامی ہوں میں
 شان میں جو اس کی جامی نے کہا

ایک ہیں، جیسے دو آنکھیں اک نگاہ
 ہم میں ہندی اور خراسانی بھی ہیں
 متصلِ مثلِ مئے و مینا ہیں ہم
 کیونکہ ہم آتشِ زنِ غاشاک ہیں
 ایک ہیں خوشیاں ہماری ایک غم
 ایک نعرے میں ہوئے سب پر عیاں
 شورِ ش فریادِ میری لے میں ہے
 ہجر میں جس کے ہو گریاں چوبِ خشک
 طور پر عرفاں کی بارش اس سے ہے
 کتنا تر پاتا ہے وہ آرامِ جاں
 میں لبِ دریا، وہ دریا در کنار
 تب ملی دولت مجھے دیدار کی
 وہ مرے محبوب کا ٹھہرا دیار
 گشتِ خوش گوئی جامی ہوں میں
 پیش کرتا ہوں وہ شعرِ بے بہا

”نسخہ کوئین رادیابہ اوست
 ۱۵ جملہ عالمِ بندگان و خواجہ اوست“

۱۔ ستونِ حنّانہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس لکڑی کے ستون سے آنحضرتؐ ٹیک لگا کر خطبہ فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر تیار ہوا اور آپؐ خطبہ دینے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہوئے تو صحابہ نے اس ستون سے چیخ کر رونے کی آواز سنی اور یوں لگا جیسے یہ ستون حضورؐ کی جدائی میں رو رہا تھا۔ اسی سبب اس کا نام ستونِ حنّانہ (نوحہ کناس ستون) پڑا۔ ۱۵ ترجمہ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کائنات کا دیباچہ ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)“

اسم اعظم سے نہیں کم اسم عشق
 لہ کامل بسطامؒ بھی کیا مرد تھا
 لہ کتنا سنت کا تھا اس کو احترام
 ہے اگر عاشق تو کر تقلیدِ یار
 ہو سکیں دل کے حرا میں لمحہ بھر
 حق سے مل کر لوٹ آ، خود میں سما
 لے چلے گا پھر تجھے سلطانِ عشق
 لے چلے گا پھر تجھے سلطانِ عشق
 اتباعِ یار بھی از قسم عشق
 اتباعِ یار میں جو مشرد تھا
 کر لیا تھا خود پہ خر بوزہ حرام
 تاکہ اک دن بن سکے یزداں شکار
 ترکِ خود کر، سوئے حق کر جا سفر
 کر دے اصرامِ ہو سس کا خاتمہ
 جا کے دم لے گا سرِ فارانِ عشق
 پھر بیاں ہونے لگیں گے تیرے گن
 لہ قولِ ربانی ہے "اِنِّیْ جَاعِلٌ"



(سلسل) ساری دنیا آپ کی غلام، در آپ ان کے آقا ہیں۔
 لہ حفرتِ یازید کی طرف اشارہ ہے جو مشہر بسطام کے رہنے والے تھے اسکی لیے یازید بسطامی
 کے نام سے مشہور ہیں اور اقبال نے یہاں انہیں "کامل بسطام" کہا ہے۔ یازید بسطامی بڑے
 پایہ کے صوفی بزرگ تھے، انہیں آنحضرتؐ سے اس درجہ عشق تھا کہ ان کا ہر قول و فعل، آدابِ نشست
 برخاست سنت کی مطابقت میں ہوتا۔ انہوں نے علم بھر خر بوزہ محض اس لیے نہیں کھایا کہ وہ یقین
 کے ساتھ نہیں جانتے تھے کہ حضورؐ یہ پھل کس طرح کھاتے تھے۔
 لہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہً۔۔۔ (میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں۔۔) کی طرف
 اشارہ ہے۔

خودی اور مفاسمی

اور سبب اس کا نہیں جزا احتیاج
تجھ کو لاحق اور نہیں کوئی مرض
قوتِ تخیل ہو جاتی ہے کُند
اپنے ہاتھوں سے خود اپنا دھن کا
غیر کے احساں سے سو بار الحذا
اسپ چوبیس کے لیے یہ طفلیگی!
مت گراؤ لے کے یوں احسانِ غیر
پارہ پارہ ہو کے مرقی ہے خودی
کر کے دریوزہ گری نادار تر
مثل مہ، رزق اپنا پہلو سے تراش
بھیک سے فطرت کو اپنی کرنے پست

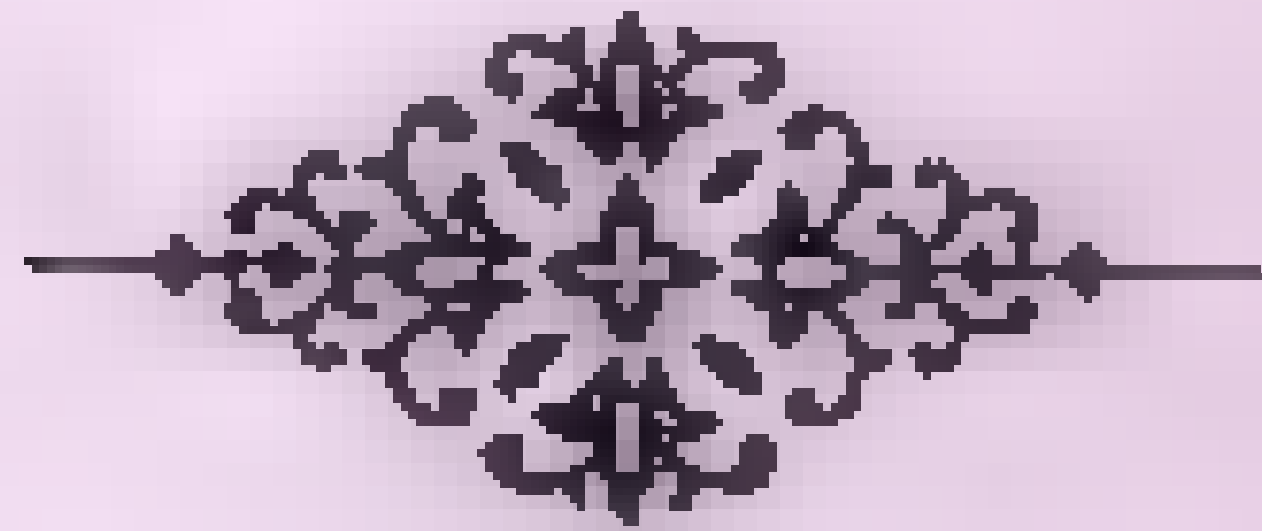
بن گیا تو شیر سے رو بہ مزاج
خستہ و بد حال کرتی ہے غرض
سست پڑ جاتی ہے اس سے فکرِ تشدد
رنگ اپنا اپنی محنت سے جما
لے خود اتر تو اونٹ سے مثل عمر
کب تک منصب کی دریوزہ گری
اپنی فطرت کو جو ہے افلاک سیر
ہاتھ پھیلانے سے ڈرتی ہے خودی
ہاتھ پھیلانے سے مفاس خوار تر
کرنے یوں اپنی خودی کو پاش پاش
گرچہ تو ہو تنگ روتی، تنگ دست

۱۔ ایک مرتبہ اونٹ پر سواری کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے تازیانہ گر پڑا تھا، وہ امیر المومنین کی حیثیت سے کسی کو تازیانہ اٹھا کر دینے کا حکم دے سکتے تھے لیکن وہ خود ہی اونٹ سے اترے اور تازیانہ اٹھا کر اونٹ پر بھر سے سوار ہوئے۔ اس شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

اپنا رزق اوروں کے دستِ خوان پر
پیشِ پیغمبرِ مبادا ہو نخل
ہے جو سورج چاند کا روضی رساں
مانگِ ہمت حق سے، لڑگردوں سے تو
قولِ پیغمبر نہ بھول اے کم نصیب
نفس ہے اس پر جو ہوا مرہونِ غیبر
حیف ہے اس پر جو اتراتا پھرے
آفریں اس پر ہے جو پیا سامرے
ہاتھ پھیلا کر جو شرمندہ نہ ہو
اے خوشادہ نو جوانِ ابرجستہ
جو تہی دستی میں ہے خود دار تر
بھیک کے ٹکڑوں میں ہے پوشیدہ آگ
اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے اگر

ڈھونڈ کر کیوں ہو رہا ہے خوار تر
روزِ محشر جو ہے کتنا جان گسل
چاند میں ہیں داغِ احساں کے نشاں
ملتِ بیضا کی رکھ لے آبرو
مردِ محنت کش ہے اللہ کا حبیب
اپنی خود داری سے جو رکھتا ہے ہیر
کوڑیوں کے مولِ عزت بیچ کے
پر نہ غیروں سے طلبِ پانی کرے
مر کے بھی وہ شخص کیوں زندہ نہ ہو
جس کا سینہ ہے تنا اور سر بلند
بختِ خفہ رکھ کے بھی بیدار تر
تجہ میں ہو غیرت تو اس سے دور بھاگ
قطرہٴ شبنم بھی ہوتا ہے گہر

قائم اپنی غیرت مردانہ رکھ
تو حبابِ آسائگوں پیمانہ رکھ



۱۔ حدیث کے الفاظ ہیں اَلْكَافِرُ بِحَبِيبِ اللّٰهِ (اپنی محنت سے روضی کمانے والے کو اللہ

پسند فرماتا ہے)۔

عشق خودی اور تسخیر نظامِ عالم

بنتی ہے فرماں دہِ عالم خودی
جن سے قدرت نے سجایا آسماں
چیر دے انگلی سے سینہ ماہ کا
زیرِ فرماں اس کے ہیں دارا و جم
جو تھے ملکِ ہند کے نامی ولی
وہ گلِ رعنا کا کرتے تھے بیاں
ان کا دامنِ مقامِ کریمِ سواد
جارِ ہاتھ بویلی کا اک مرید
ساتھ تھے اس کے غلام و چوہدار
اس نگر کا سن لے ہر چھوٹا بڑا

عشق سے ہوتی ہے جب محکم خودی
ہیں خودی کے غنچہ ہائے ضوفاں
ہاتھ اس کا ہاتھ ہے اللہ کا
اختلافاتِ جہاں میں وہ حکم
اب سنو مجھ سے حدیثِ بویلیؑ
چھیڑ کر باغِ کہن کی داستاں
ہے زمیں کا خطِ آتشِ نرادر
ایک دن بازار کو بہر خرید
شہر کا عامل بھی آتا تھا سوار
اک نقیب اس کا لگاتا تھا صدا

لے بویلی قلندر ان کا نام شرف الدین قلندر تھا۔ پانی پت کے مشہور ولی۔ پانی پت ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ امیر خسرو کے ہم عصر تھے۔ علامہ حضرت بویلی کی مشنوی کنز الاسرار کے اس نعتیہ شعر کی طرف اشارہ

مرصباے بلبلی باغِ کہن از گلِ رعنا بگو ہا ما سخن

(اے باغِ کہن سے آئے ہوئے بلبلی خوشن آمارید، تو ہیں اس باغ کے گلِ رعنا کے بارے میں پوچھ سنا)

”باغِ کہن“ سے، سام و گلِ رعنا سے اخذ کیا گیا ہے۔ اشارہ پانی پت کی طرف جہاں دفعت گری تیرتی ہے

حکم ہے یہ حاکم ذیجباہ کا
 راہ میں لیکن وہ درویش خدا
 جب یہ دیکھا کہ نہیں ہٹتا فقیر
 اتنا غصہ تھا کہ تھراٹے لگا
 وہ فقیر خسہ کرتا آہ آہ
 بوعلی سے اس نے پھر فریاد کی
 سن کے یہ، حالت عجب تھی شیخ کی
 شیخ کو اس طرح آیا تھا جلال
 اس قدر غصے سے بے قابو ہوئے
 تم ابھی سلطان کو فرماں لکھو
 اس کو جانب سے ہماری یہ کہو
 کیوں سر بازار یوں رسوا کیا
 سن ہمارا فیصلہ اے تیرہ بخت
 شاہ نے جس وقت یہ فرماں پڑھا
 اس نے عامل کو کیا زنجیر پا
 میر خسرو شاعر رنگیں بیاں
 جن کو سلطان نے بنایا تھا سفیر
 پھر غزل پیشِ قلم در چسبہ کر
 نغمہ خسرو میں تھا ایسا کمال
 جو نہ تھا کم سمجھتی کہسار سے

راستہ رکھو سواری کا کھلا
 بھٹا کھڑا افکار میں ڈوبا ہوا
 تاؤ میں آیا نقیب بے ضمیر
 لاٹھی بے چارے پر برسانے لگا
 جیسے تیسے آیا نزد خانقاہ
 کی شکایت اس ستم ایجاد کی
 جیسے بجلی کوہ پر ہو آگرمی
 جیسے ساحل دے سمندر کو اچھال
 اپنے منشی سے یہ فرمانے لگے
 اس کو مرد جاہل و نادان لکھو
 تیرے عامل نے ہمارے دوست کو
 تو نہیں دے گا اگر اس کو سزا
 اور کو دے دیں گے تیرا تاج و تخت
 بید کے مانند تھراٹے لگا
 عفو نامہ پھر قلمدر کو لکھا
 مطلب آتش نوا، شیریں زباں
 عفو نامہ لے کے پہنچے نزد پیر
 وہ سماں باندھ کہ تھا جادو اثر
 پڑ گیا ٹھنڈا قلمدر کا جلال
 وہ پسچا نغمہ گفتار سے

تو فقیہوں کی دما زاری نہ کر
 آگ میں گرنے کی تیاری نہ کر



نقہ خودی۔ غلامی کا فلسفہ

تھی کہیں پر اک چراگاہ قدیم
نسل افزا تھا بہت وہ سبزہ زار
کوئی کھٹکا تھا نہ خطرہ تھا نہ ڈر
اُن کی بدبختی کہ اک شب ناگہاں
دھاڑتے آئے وہاں جنگل کے شیر
شیر کی فطرت ہی ہوتی ہے شکار
پھر ہوا اعلان بعد قتل عام
حکمرانی طاقت وصول کا نام
گرگِ باراں دیدہ تھا اک گوسفند
سوچتا تھا کب تک ماتم کریں
کس طرح ہو ناتوانی کا علاج
سچ تو یہ ہے شیر کا بچہ بھی شیر
ہے کہاں دنیا میں ایسی کمیہا
ایک ہی بس ہے علاج درد و غم
جب غلاموں میں نہ ہو زورِ ستیز

تھیں جہاں بھیڑیں فراغت سے مقیم
پل رہی تھیں جس میں بھیڑیں بے شمار
زندگی آرام سے کرتیں بسر
آگری ان پر بلائے آسماں
کر لیا اک آن میں بھیڑوں کو زیر
خون سے تھا لال سارا مرغزار
آج سے بھیڑیں ہماری ہیں غلام
حکمرانی قوت و شوکت کا کام
فتنہ زرا چالاک زیرک ہوشمند
کیوں نہ سامان تحفظ ہم کریں
شیر اگر ہیں سنگ تو بھیڑیں زجاج
گوسفندوں سے نہ ہو پائیں گے زیر
جس سے بھیڑوں کو بنائیں بھیڑیا
گوسفندی شیر کو سکھلائیں ہم
ہوتے ہیں تدبیر سازی میں دہیز

ان میں چالاکی کے آجاتے ہیں گن
 فتنہ پرور ہوتی ہے عقلِ غلام
 اور پھر اس نے کیا آغازِ پند
 اے درندو! ہوش کی کھاؤ دوا
 قتل و غارت میں بہت بدنام ہو
 چھوڑ دو سارے برائی کے یہ کام
 تم نہ بھولو یومِ نحسِ مستمیر
 ہے یہ سارا گوشت خوری کا قصور
 درحقیقت یہ ہے روحانی غذا
 کیوں نہ رہبانی کرو تم اختیار
 ہے نہاں ترک خودی میں زندگی
 کھاتے جاتے تم کو یہ اپنا ہی زہر
 زور و طاقت میں خرابی ہے تما
 تم غریبی میں کرو اپنی بسر
 دانہ گر خرمن بنے تو ہے زیاں
 تاکہ سورج کی چمک سے جی اٹھو

ان کے اعضاءِ عمل ہوتے ہیں سن
 دل میں پلتا ہے جنونِ انتقام
 بن گیا واعظ وہ دانا گو سفند
 ہو کے شیروں سے مخاطب یہ کہا
 تم ہو وحشی اور خوں آشام ہو
 میں ہوں تم شیروں کا روحانی اما
 پھر کہا: اے قومِ کذابِ اثر
 زور و طاقت ہو تو آتا ہے غرور
 صرف سبزی پر کرو تم اکٹفا
 ترک کر کے زور و طاقت کا شعار
 شخصِ تند و زور آور ہے شقی
 تیز دندانی سے ہو رسوائے دہر
 ناتوانوں کا ہے جنت میں مقام
 جستجوئے عظمت و شوکت ہے شر
 تاک میں دانے کی بجلی ہے کہاں؟
 تم سمٹ کر دشت سے ذرہ بنو

۱۔ اے کذابِ اثر (جھوٹا اور خود پسند) یہ الفاظ قومِ ثمود نے اپنے پیغمبر حضرت صالحؑ کے لیے استعمال کیے تھے اور یومِ نحسِ مستمیر (ایک منوس دن) وہ الفاظ ہیں جو قرآن میں قومِ عاد پر عذابِ نازل کرنے سے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ پوری آیت یہ ہے: اِنَّا ارسلنا علیہم رسلًا صرًا فی یومِ نحسٍ مُّستمِرٍّ (ہم نے ان پر (یعنی قومِ عاد پر) ایک منوس دن تیز و تند آمد بھیجی) (سورۃ قرآیت ۱۹)۔
 ۲۔ گو سفند یہ قرآنی الفاظ استعمال کر کے شیروں کو ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے اس کی بدلتی اور مکاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

کیوں ہونا زان ذبح کر کے گو سفند
زندگی کو کرتے ہیں ناپائیدار
سبزہ پامال اُگ کر بار بار
بے خودی کا نام ہے فرزانگی
چشم و گوش و لب رکھو ہر وقت بند
یہ غلف ترا جہاں ہے اک سراب
شیر جو پہلے سے اب کم کوش تھے
چل گی دل پر فسوں گو سفند
گو سفندوں کا جو کرتے تھے شکار
اب وہ خوش ہو ہو کے کھاتے تھے غلف
اُن کے دانتوں میں صلابت اب تھی
جیسے اک سر باز کا سر اڑ گیا
کوشش پیہم پہ اب مائل نہ تھا
عزم تھا باقی، نہ استقلال تھا
آہنیں پنچوں میں اب وہ دم نہ تھا
تن ہوا کمزور ضعف جاں بڑھا
سو خرابی لائے اک کم ہمتی
خواب درویشی میں ایسا کھو گیا

نفس کو مارو کہ ہے کارِ بلند
جبر و قہر و انتقام و اقتدار
کہہ رہا ہے جادواں ہے خاکسار
پاسداریِ خودی، دیوانگی
تاکہ گردوں سیر ہو فکرِ بلند
تم کرو ہر وقت اس سے اجتناب
پند و اعظ سنتے ہی مدہوش تھے
ان کو آیا پند خواب اور پسند
کی انہوں نے گو سفندی اختیار
رفتہ رفتہ ہو گئی شیری تلف
شعلہ بار آنکھوں میں بیت اب تھی
آئینے سے اس کا جو ہر اڑ گیا
جس میں ہو ذوقِ عمل وہ دل نہ تھا
سا کہ تھی باقی، نہ وہ اقبال تھا
جس کا شیروں کو ذرا بھی غم نہ تھا
زندگی میں موت کا ارماں بڑھا
کوہِ دستی، بیدلی، دواں فطرتی
شیر تھا بیدار لیکن سو گیا

سچ تو پوچھو جادوئے میثی ہے یہ

شیر کہتا ہے کہ درویشی ہے یہ



فکرِ افلاطون

سرگردہ گو سفندانِ قدیم
ساحلِ محسوس سے تھا بے نیاز
کرنہ پایا اعتبارِ چشم و گوش
شمعِ مردہ میں چھپی ہے روشنی
گو پلاتا تھا مئے افسردہ کن
بچ گئے صوفی کو اس کے وعظ و پند
عالمِ اسباب تھا نامعتبر
چاہتا تھا کھولنا بابِ حیات
اس کی رو سے بود بھی نہ بود تھا
وہ سمندر کا بناتا تھا سراب
وہ عمل کے ذوق سے محروم تھا

راہبِ دیرینہ، افلاطونِ حکیم
قلزم، معقول میں، س کا بہار
عشقِ نامحسوس میں گم کر کے ہوش
اس کی رو سے موت میں ہے زندگی
اک جہاں گاتا رہا ہے اس کے گن
تھا لباسِ آدنی میں گو سفند
اس کی نظروں میں کہ تھیں افلاک پر
منتشر کر کے وہ اسبابِ حیات
اس کی نظروں میں زیاں بھی سود تھا
چشمِ بینا کے لیے بنتا تھا خواب
اس قدر دارِ فستہ معدوم تھا

۱۔ معقول۔ وہ عام جو عقل کے توسط سے حاصل ہو سکے محسوس۔ جو اس خمسہ کے ذریعے حاصل
ہونے والا علم۔ افلاطون جو اس خمسہ کے علاوہ غیر معتبر سمجھتا تھا کیونکہ اس کے نظریے کے
مطابق مادی دنیا کا کوئی حقیقی وجود نہیں بلکہ یہ عین مشاق کی نقل ہے لہٰذا محسوس مراد خیالی وجود۔

مستکر ہنگامہ موجود، وہ
 زندہ دل کو عالم امکان بہت
 اس کے آہو میں نہ تھا لطفِ خرام
 اس کی شبیم ذوقِ رم سے بے خبر
 تخم میں اس کے نہ تھا ذوقِ نمو
 زندگی میں دیکھ کر شورِ نشور
 اس نے جو دنیا بنائی پست تھی
 سوئے گردوں گرچہ اڑ کر جاسکا
 اس کی مے افلاک میں کرتی ہے گم
 خالق "اعیانِ نامشہود" وہ
 مردہ دل کو عالمِ اعیان بہت
 لذتِ رفتار تھی اس پر حرام
 اس کا طائر تھا شکستہ بال پر
 وہ تھا اک پروانہ ناشمعِ جو
 راہِ بے چارہ تھا دنیا سے دور
 نشہِ افیوں سے گویا مست تھی
 پھر نہ واپس آشیاں میں آسکا
 میں نہ جانوں ڈرو ہے یا خشتِ خم

اس کے نشے سے ہوئیں تو میں خراب
 ہو گئیں محرومِ ذوقِ انقلاب

لے اعیان۔ عین کی جمع، یہاں عین کے معنی ہیں کسی مادہ شے کا مخصوص تصور یا خیال جسے
 انگریزی میں آئیڈیا (IDEA) کہتے ہیں۔ چونکہ اعیان نظر نہیں آسکتے اس لیے انہیں نامشہود
 (دکھائی نہ دینے والے) کہا گیا ہے۔ فلسفہ افلاطون کی رو سے "عین" یا کسی شے کا مخصوص تصور
 ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس تصور سے متعلقہ مادی شے حقیقی نہیں بلکہ صرف اعتباری
 وجود رکھتی ہے مثلاً "گھر" کا مخصوص تصور انسانی ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے اور جس گھر
 کو ہم دیکھتے یا اس میں رہتے ہیں وہ گھر کے "عین" کی محض نقل ہے۔ افلاطون کی نظر میں خدا
 عینِ مطلق ہے اور یہ کائنات اس کا عکس یا نقل ہے۔ افلاطون کے اسی نظریہ عینیت سے
 عجمی تصوف کے لیے راہ ہموار کی اسی لیے اقبال نے افلاطون کے نظریہ عینیت کی شدید مذمت کی ہے

حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ

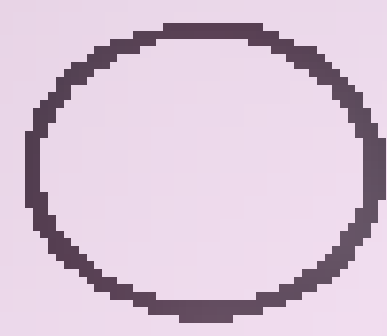
نور بر سائے چہرِ آغِ آرزو
تیز فکر و تیز فہم و تیز گام
آرزو اس خواب کی تعبیر ہے
حسن کو ہے دل کا پیغامِ آرزو
جس سے پیدا زندگی میں زیرِ دم
اس کو پائے گا تمنا آفریں
اس سے پیدا آرزو در آرزو
حسن ہے پروردگارِ آرزو
اُس کی ہستی مطلعِ انوارِ حسن
اس کے جادو سے جہاں محبوبِ تر
اس کا غازہ حسن افزائے بہار
نعرۂ حق وہ دل دیوانہ میں
اصل قصے میں مزہ ایسا کہاں!
اس کے دل میں سو جہاں تازہ تر
اُن سنے نالوں کا وہ ہے نغمہ زار

دل کو گرمائے جو داغِ آرزو
آرزو سے زندگی آتشِ بھام
زندگی کا حاصل تسخیر ہے
ہے شکاری زندگی، دامِ آرزو
سن لے رازِ آرزو نے دمِ دم
جو بھی شے ہے دلفریب و دلنشین
نقشِ زیبِ جب تک ہے روبرو
حسن، غلاقِ بہارِ آرزو
سینۂ شاعر، تجلی زارِ حسن
خوب کو شاعر بنادے خوب تر
نغمہ بلبیل میں ہے اس کا نکھار
سوزِ شاعر ہے دلِ پروانہ میں
قصہ دل میں ہے وہ حسنِ بیاں
ہستی شاعر میں ہیں سو بحر و بر
اُن کھلے پھولوں کی ہے اس میں بہار

زشت سے نا آشنا، خوب آفریں
اس کے اشکوں میں مئے نابِ حیات
چلتے چلتے جب بھی ٹھک جاتے ہیں ہم
ہم کو منزل کی طرف لاتا ہے وہ
علقہ، کامل بنے تو س حیات
پیچھے پیچھے ہم، تو آگے وہ صرا
لالہ و گل میں چلے مثلِ شمیم
محتسب خود کی، خود آرا زندگی

ماہ و انجم کا ہے شاعر ہم نشین
قلب شاعر حاملِ آبِ حیات
راہ میں جب بھی بھٹک جاتے ہیں ہم
مثلِ بیلِ گاکے پہلاتا ہے وہ
تاکہ ہم پا جائیں فردوسِ حیات
کاروانوں کے لیے بانگِ درا
وہ ہمارے باغ کی بادِ نسیم
اُس کے جادو سے خود افزا زندگی

اس کا دسترخوان ہے سب کے لیے
آگ سے اپنی جلاتا ہے دیے



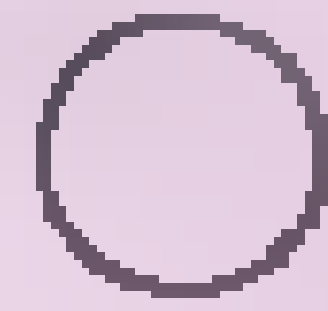
جن کے شاعر ہیں نہیں ذوقِ حیات
تہر دیتا ہے ہمیں کہہ کر دوا
ہے طلوعِ مہر میں اس کا غروب
گائے تو بیل بھی اڑنا جائے بھول
بن کے وہ رنگیں بیاں کرتا ہے چھل
اس نے شاہیں کو سکھائی کرگسی
بھولی بھائی شکل والی، چھل بھری
ساحری کے نام پر ہے فتا ہری
اپنی کشتی کو ڈبوئے نا خدا
اُس کا جادو موت کو بولے حیات

اُف وہ قومیں جو کر رہیں مرنے کی بات
حیف کہ وہ شاعرِ جادو توا
آئیے میں زشت کو دکھلائے خوب
پھول کو چوے تو ہو پڑ مردہ پھول
اس کی افیوں سے ترے اعصابِ شل
سرو پر چھائی ہے اس سے بے کسی
ماہیِ آدم نما، اک جل پری
کیا بتاؤں کیا ہے اس کی شاعری
وہ اگر گائے تو سوئے نا خدا،
اُس کے نغمے چین لیں دل کا ثبات

اُس پر جو ریچھے وہ جائے جان سے
وہ بدلتا ہے زیاں کو سود میں
اور عمل سے روک لیتا ہے تجھے
وہ کرے خستہ دلوں کو خستہ تر
ہے سرابِ رنگ و بو اس کا پتہ
اگر ہو بھی تیرا بن جاتی ہے قہر
جیسے ہو جادو کی کوئی طشتری
پھونک کر دل کی بجھا دیتا ہے آگ
سانپ سویا ہے گلوں کے ڈھیر میں

لوٹ لیتا ہے وہ اپنی تان سے
بے کسی کو ڈھل کر بہبود میں
دوسو سوں میں جھونک دیتا ہے تجھے
ہو کلام اس کا اگر برجستہ تر
وہ سکھاتا ہے فقط مرنے کا فن
اس کے خیساں میں نہیں بجلی کی لہر
حسن ہے اس کا صداقت سے بری
خواب کا متوایا کہتا ہے نہ باگ
پڑ نہ بیل کی صدا کے پھیر میں

الحذر اس شاعری سے الحذر
نقشِ جام و رنگِ مینا سے گزر

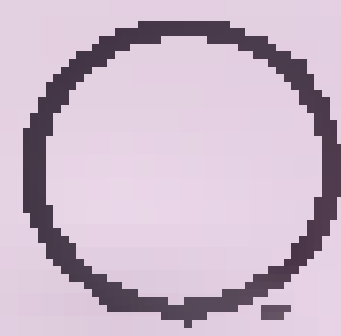


صبح کرتا ہے اُسی کے جام سے
زہر قاتل پی نہ یوں ازراہِ گوش
ہے دلیلِ بیدلی و بیدمی
دہر میں ننگِ مسلمانی ہے تو
نازک اتنا کہ ہوا تجھ کو گڑے
عشق یہ تیرا ہوس انگیز ہے
اس کو ٹھٹھا کر گئی سردی تری
ناتوانی سے تری وہ ناتواں
پڑے آہوں کے دھویں اس کی شام

تجھ کو گھین آتی تھی جس کے نام سے
چھین لیتا ہے یہ نغمہ تیرے ہوش
ساز میں تیرے یہ نغموں کی کمی
کتنا مانوس تن آسانی ہے تو
جب چلے تیری کمر میں بل پڑے
گو تری فدا و طوفاں خیز ہے
عارضِ شاعر میں ہے زردی تری
وہ تری خستہ دلی سے خستہ جاں
اشکِ طفلانہ سے پھر ہیں اس کے جاں

مانگ کے پیتا ہے وہ میخوار سے
 پاشکستہ، سربرہنہ، سرگراں
 سوکھ کر کانٹا ہوا اس کا بدن
 کینہ تو زری اور خوشامد میں ہے طاق
 تیرہ بخت و زیر دست و دوں نہاد
 اس کے نالوں سے توبے مایہ ہوا
 جھانکتا ہے روزِ دیوار سے
 ٹھوکریں درباں کی کھا کر نیم جاں
 ہے لبوں پر شکوۂ چرخ کہن
 ضعف کا اس کے اڑاتے ہیں مذاق
 ناسرا و ناامید و نامراد
 نیند سے محروم ہمسایہ ہوا

کیا مزہ اب عشق کے افسانے میں
 مرگیا ابنِ حرم بُت خانے میں

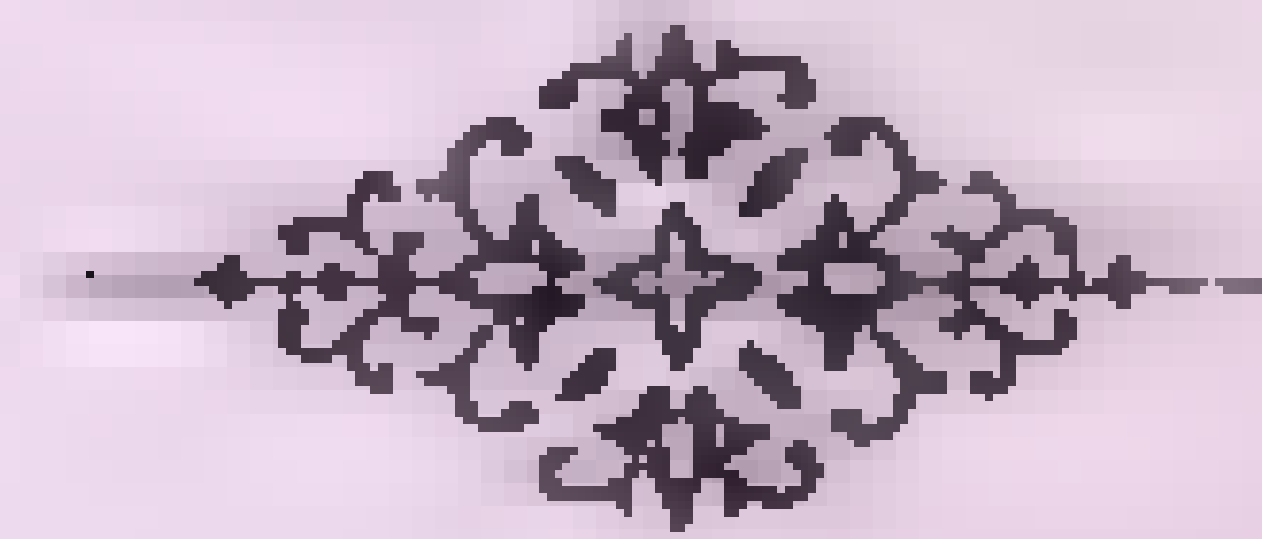


جیب میں نقدِ سخن ہرگز نہ رکھ
 فکر روشن ہے عمل کی راہ پر
 مڑ کے تو دیکھے اگر سوئے عرب
 تو جو "سلمانے عرب" پر ہو فدا
 پھر تو، کر سکتا ہے، اندرونِ نیاز
 تو نے دیکھے ہیں عجم کے لالہ زار
 زندگانی کی کسوٹی پر پرکھ
 جس طرح بادل کی ہو بجلی نظر
 فکرِ صالح سے رچے تیرا ادب
 وہ اگر بن جائے تیری دلربا
 پیدا شامِ کُرد سے صبحِ حجاز
 تو نے لوٹی ہند و ایراں کی بہار

۱۔ سلمانے عرب۔ ادبیات عرب میں سلمیٰ ایک فرضی اور مثالی محبوبہ ہے۔
 ۲۔ شیخ حسام الحق ضیاء الدین کے مقولہ اَمْسَيْتُ كُردِيَا أَصْبَحْتُ عَنْ بَيْتِ شَامِ کو میں کُرد میں
 ہوتا ہوں اور صبحِ حجاز میں) اقبال کی مراد یہ ہے کہ سلمانے عرب کو مثالی محبوبہ بنانے سے اہل اسلام
 میں وہ روحانی قوت پیدا ہوگی جو امتیازِ عجم و عرب کو مٹا دے گی۔ کُرد میں شام اور حجاز میں صبح
 گزارنے سے یہی مراد ہے۔

آفدم اب وادی صحرا میں رکھ
 ریت پر صحرا کی چلنا اور ہے
 تو نے ریشم کے بہت پہنے لباس
 تو بساطِ لالہ پر سویا بہت
 چمک لے رنگ گرم کا بھی کچھ مزا
 مثلِ بلبیل چھپھانا کب تک!
 رشکِ شاہیں! تیری منزلِ آسماں
 جو ہوشاہیں کے نشیمن سے بلند
 بادۂ دیرینہ خرما بھی چمک
 بادِ صرصر میں مچلنا اور ہے
 دیکھ لے یہ بھی ہے کیا عربی کپاس
 مثلِ گلِ شبنم سے مرنہ دھویا بہت
 چشمہ زمزم میں بھی غوطے لگا
 شاخِ گل پر آشیانہ کب تک
 کوہ پر اپنا بنا لے آشیاں
 برق پھینکے جس پہ رہ رہ کر کند

تاکہ تو ہواہلِ پیکارِ حیات
 جسم و جاں میں ہو ترے نارِ حیات



(۱۰)

مراحل تربیت خودی

(۱) مرحلہ اول — اطاعت

خدمت و محنت شتر کا ہے شعار
 طے خموشی سے کرے راہِ دراز
 کم خور و کم خواب و محنت آشنا
 مست، تیز بارِ محل ہے رواں
 کتنا خوش خوش ہے دواں مستاندار
 تو بھی محنت کر کہ دینا ہے حساب
 کراطاعت تو بھی اسے غفلت شعار
 سر بزیری میں چھپی ہے سروری
 خود کو جو پابستہ آئیں کرے
 گل سے وابستہ صبا خوشبو بنے
 کیوں نہ تارے گھر سے نکلیں گھر چلیں
 سبزہ، آئیں تم کو کا ہے کمال

ہے قناعت اس کی عالم آشکار
 اس کو سب کہتے ہیں صحرا کا جہاز
 نقشِ پا اس کا ہے وقت آشنا
 خوش خراماں سوئے منزل ہے رواں
 خوش نہ ہوگا اتنا خود اس کا سوار
 کر ریاضتِ بلندۃ حسن المآب
 جبر سے ہوتا ہے پیدا اختیار
 آگ کو ایندھن بنائے سرکشی
 کیوں نہ تسنیر مہ و پردیں کرے
 بند خوشبو نافہ آہو بنے
 وہ اگر آئیں فطرت پر چلیں
 ترک آئیں سے ہوا وہ پائمال

لے عِنْدَهُ حَسَنُ الْمَآبِ۔ قرآنی آیت کا ٹکڑا جس کے معنی ہیں خدا کے پاس بہترین ٹھکانہ

یا انجام ہے۔

آگ میں جلنا گل لار کا کام
 قطرے کو دریا کرے آئین وصل
 جب تلک آئین کی ہو پیروی
 پھر ہے اے آزاد دستور قدیم
 بے یہی آئیں کہ ہو آتش بجام
 ذرے کو صحرا کرے آئین وصل
 کیوں نہ پھر ہر شے کا باطن ہو قوی
 چل اسی پر جو ہے راہ مستقیم
 شکوہ منج سختی آئیں نہ بن
 طاعت احمد کائنات چیں نہ بن

(ب) مرملہ دم — ضبطِ نفس

نفس امارہ میں ہے خود پروری
 ہاتھ میں رکھ نفس کی اپنے لگام
 حکمراں خود پر نہیں کوئی اگر
 چاہے جس دم ہوئی تعمیرِ دل
 خوفِ دنیا، خوفِ عقبی، خوفِ جاں
 چاہے ملک و قوم کی، دولت کی چاہ
 جب ہوا مٹی سے پانی کا ملاپ
 تن، نواہی کی طرف مائل ہوا
 پر جو رکھے گا عصلے لا الہ
 حق پرستی جس کے دل میں کم نہ ہو
 نام سے وہ خوف کے مرتا نہیں
 ماسوا کی راہ جس نے بند کی
 ماسوا سے جو کرے صرفِ نظر
 خود پرستی، خود نمائی خود سری
 مرد بننا ہے تو کر اس کو غلام
 یہ سمجھ ہے زیر فرمانِ دگر
 خوف بھی تھا شاملِ تقدیرِ دل
 خوفِ آلامِ زمین و آسمان
 چاہے خویشاوند کی، عزت کی چاہ
 آگئی تن پروری اپنے ہی آپ
 خود تباہی کی طرف مائل ہوا
 خوف سے ہر وقت پائے گا پناہ
 پیشِ باطل اس کی گردن خم نہ ہو
 ماسوا سے وہ کبھی ڈرتا نہیں
 چاہے کیا اس کو زن و فرزند کی
 وہ چھری رکھے پسر کے حلق پر

ہو کے تنہا بھی وہ مثل فوج ہے
 لا الہ مثل صدق، گوہر نماز
 ہاتھ میں مسلم کے خنجر ہے نماز
 مار کر روزہ بدن کی بھوک پیاس
 نسل و قومیت شکن ہوتا ہے حج
 حج وہ طاعت، جو ہے جمعیت پسند
 حب دولت کو مٹاتی ہے زکوٰۃ
 دل کو "حَتَّى تَنْفِقُوا" محکم کرے
 ان کا مقصد تجھ میں استحکام ہو
 دم کو کہتا ہے ہوا کی موج ہے
 حج اصغر سے نہیں کستہ نماز
 قاتلِ فحشا و منکر ہے نماز
 عیشِ لا فانی کی رکھتا ہے اساس
 غالبِ حب الوطن ہوتا ہے حج
 منتشر اوراق کی شیرازہ بند
 ایک ساسب کو بناتی ہے زکوٰۃ
 حب کثرت کو نہایت کم کرے
 ہاں مگر پختہ ترا اسلام ہوا
 چشمِ دل سے دیکھ کہہ کر یا قوی
 بندشِ تن میں نجاتِ اخروی

لہ فحشا و منکر۔ بے حیائی اور ناپسندیدہ بات۔ اس شعر میں نماز سے متعلق اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذٰلِكَ كُرِّمَ اللّٰهُ الْکَبِیْرُ (بے شک نماز بے حیائی، اور ناپسندیدہ بات سے روکتی ہے۔ اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے) سورہ عنکبوت آیت ۵۴
 حَتَّى تَنْفِقُوا۔ جب تک تم خرچ نہ کرو۔ اس قرآنی آیت کی تلمیح جس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے زکوٰۃ، صدقات، خیرات دینے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا گیا ہے: لَنْ تَذٰلُوا الْبِرَّ حَتَّى تَنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم نیکی اس وقت تک نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم اپنی محبوب چیزیں (مراد مال دولت) اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

سہ اسم یا قوی کا ورد

(ج) مرحلہ سوم — نیابت الہی

اے مشترباں! تو جہاں نبائی کرے
 رہتی دنیا تک جہاں آرا رہے
 حکم فرمائے عناصر تو بنے
 نائب حق کیا بتاؤں کون ہے
 نائب حق روح عالم کی مثال
 رازِ جز و کل سے ہے آگاہ وہ
 اس جہاں میں جس گھڑی ہو خیزن
 اس کی فطرت میں ہے تخلیق و نمود
 سو جہاں اس کے تصور میں ملیں
 اس کو نفرت ہر خیالِ غام سے
 اُس کا جینا ہے اگر حق کے لیے
 اس سے پیری میں بھی آہنگِ شباب
 وہ نذیرِ نوع انسان و بشیر
 مددِ علمِ الاسماء ہے وہ

زیب سر تاجِ سلیمانی کرے
 تاجدارِ ملکِ لایبلی رہے
 نائب حق بن کے ناصر تو بنے
 مثلِ موسیٰ بالکِ فرعون ہے
 جس میں ظلّ اسمِ اعظم کا جلال
 دہر میں قائم بامرِ الشد وہ
 پہلے وہ برہم کرے بزمِ کہن
 جس سے پاتے ہیں کئی عالم وجود
 پھول جیسے گلستانوں میں کھلیں
 پاک کعبے کو کرے اصرام سے
 جان بھی دے قولِ برحق کے لیے
 اس کا ہر شے پر چڑھے رنگِ شباب
 وہ سپاہی وہ مقتن وہ امیر
 سرِ شہانِ الذی اسرّی ہے وہ

۱۔ ملکِ لایبلی۔ وہ سلطنت جسے نہ دال نہ آئے۔ قرآن میں یہ فقرہ ابلیس کی طرف منسوب ہے۔ پوری آیت یوں ہے: "يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةٍ الْخُلْدِ وَعَلَىٰ لَيْبَلٰی"۔ شیطان حضرت آدم کو پھسلانے کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتا ہے (آپ کو ہمیشہ رہنے والے درخت اور ایسی سلطنت کا پتہ دوں جو لازوال ہے)۔ ۲۔ علمُ الاسماء (ہم نے چیزوں کے نام سکھائے) سورہ بقرہ (اگلے صفحہ پر)

وہ عصا رکھے، ید بیضا کے ساتھ
 ہو غناں دردست جب وہ شہسوار
 خشک کر دے اس کی ہیبت نیل کو
 اس کے قدم سے قبر تن میں مردہ جاں
 ذات سے اس کی ہو توجیہ جہاں
 اس کے سائے کا طلب گار آسماں
 جانقزا ہے اس کا اعجازِ عمل
 اس کے نقشِ پایہ گل پھولیں بھلیں
 زندگی کی اس سے ہو تفسیر نو
 نائبِ حق، واقفِ رازِ حیات
 فطرت اک شاعر، وہ شعر بے بدل
 جب فلک رس ہو مرے دل کا غبار
 آج میری خاک میں سویا ہے وہ
 ہے مرا غنچہ چمن اندر چمن
 اے سوارِ اسپِ دوراں! آ بھی جا

علم و قوت اس کے حق میں ایک بات
 تیز تر دوڑے سمندر روزگار
 مصر سے لے جائے اسرائیل کو
 اٹھ کھڑے ہوں جیسے سرِ و گلستاں
 اور جلال اس کا نجات این و آل
 اُس کے دم سے مایہ ہستی گراں
 وہ کرے تجدید اندازِ عمل
 سو کلیم اس طور کی خاطر بلیں
 خواب کی کرتا ہے وہ تعبیر نو
 ناشنیدہ نغمہ ساز حیات
 ہے غزل دنیا تو وہ بیت الغزل
 اس سے نکلے کاشش میرا شہسوار
 شعلہ فردا مرا گویا ہے وہ
 میری آنکھیں صبح فردا میں لگن
 اے فروغِ چشمِ امکاں! آ بھی جا

(مسل) کی اس آیت کریمہ کی طرف تلمیح جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو کائنات کا علم دے کر فرشتوں کے سامنے پیش کرنے کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ سبحان الذی اسریٰ۔ (پاک ہے وہ ذات جس نے رات میں چلایا)

سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت مبارکہ جس میں اللہ تعالیٰ نے معراجِ نبی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ (حضرت محمدؐ) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے

گرداگرد ہم نے برکت دی ہے" (سبحان الذی اسریٰ سے اشارہ معراج کی طرف ہے۔

رونقِ ہنگامہٴ ایجابِ بن
 شورشِ اقوام کو خاموش کر
 پھر انوت کا سبق ان کو پڑھا
 پھر سے اس عالم میں لایامِ صلح
 نوعِ انساں کا دھڑکتا دل ہے تو
 رُت ہے پت جہڑ کی پڑے جانِ بہار
 اپنے دیوانوں کی پھراک اک جبین
 پھر سے تسکینِ دلِ ناشادِ بن
 اپنے نغموں سے انہیں مدہوش کر
 ان کی جانب ساغرِ الفت بڑھا
 جنگِ بازوؤں کو سناپیغامِ صلح
 کائنات شوق کا حاصل ہے تو
 آ بھی جا کہ تجھ سے ہے شانِ بہار
 جوم لے کہ ان میں سجدے ہیں مکین

یہ سبجہ کر تو کرے گا سرفراز
 ہم اٹھاتے ہیں غمِ دنیا کے ناز



۱۱

اسرار اسمائے حضرت علیؑ

مسلم اول، شہِ مرداں علیؑ
وہ علیؑ، مشکل کشا، عالی تبار
یہ اسی کا دیکھ روحانی اثر
مثل نرگس، عاشقِ نظارہ میں
سستِ زمزم ہوں انھیں کے نام سے
خاک ہو کر بھی ہوں میں آئینہ وار
اُن کے رخ سے فال لیتے تھے رسول
قول ان کے، قوتِ دینِ مبیں
اُن کو کہتے تھے محمدؐ "بو تراب"
جو ہیں دانائے رموزِ زندگی
ہم جسے کہتے ہیں، تن ہے آب و گل
فکرِ گردوں کو زمیں پر لائے "تن"
ہاتھ میں تیغ ہو س رکھتا ہے تن
تن کی یہ مٹی کہ جو زنجیر ہے
فاتحِ تن بن کے لائے انقلاب
ان کی شہرت ان کی کڑاری میں تھی
حکم دے جب کوئی بن کر بو تراب
جس کے مرکب پر کسا ہوتا ہے زین

عشق کا سرمایہ ایماں علیؑ
قائداں سے جن کے میں رکھتا ہوں پیار
دہر میں تابندہ ہوں مثل گہر
مثل بو اس باغ میں آوارہ میں
میں چھلکتا ہوں انھیں کے جام سے
دیکھ لو میری نوا سیٹے کے پار
یاد ان کی دل پہ برساتی ہے پھول
حنا نوا دہ ان کا ہے حبلِ متین
دستِ حق کا بھی بلا حق سے خطاب
جانتے ہیں سرِ اسمائے علیؑ
عقل ہے اس کے تقاضوں پر خجل
خس سے چشم و گوش کو بہلائے "تن"
رہروانِ شوق کا ہے راہزن
شیرِ حق کے ہاتھ میں اکیر ہے
اس لیے کہتے ہیں ان کو بو تراب
ان کی قوت ان کی خود داری میں تھی
کیوں نہ پھر مغرب سے پلٹے آفتاب
ہے اسی کا یہ جہاں، یہ سرزمین

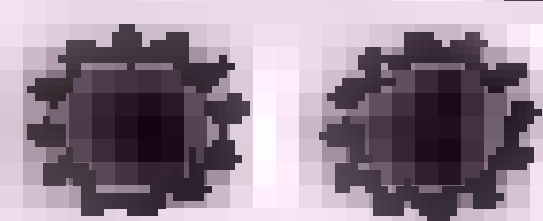
اس جہاں میں فاتح خلیفہ برہی
 خود شناسی سے ید اللہی ملی
 وہ کہ تھے دروازہ شہر علوم
 جس کی مٹھی میں بدن کی خاک ہے
 جل کے بننا خاک پروانے کا کام
 بن تو پہلے سخت اے نازک بدن
 خود کی مٹی سے تو اک آدم بنا
 خاک سے اپنی بنا اپنا مکان
 میں نے مانا چرخ کے ہاتھوں پر تگ
 نالہ و فخر یاد و ماتم تا بہ کئے
 ہے عمل کے زور سے نور حیات
 اٹھ کہ تخلیق جہان تازہ ہو
 ہو کے آتش پیرہن بن جا خلیل
 ساز مت کر حالت ناساز سے
 ایسے خود داروں سے جو ہیں پختہ کار
 اور زمانہ ہو اگر ناساز گار
 وہ نظام کہنہ کی جڑ کاٹ کر
 گردشِ ایام سے لڑتا ہے وہ
 اپنی قوت سے کرے وہ آشکار
 جی نہیں سکتا یہاں گر شان سے
 مشکلوں کا سامنا کر کے ہی شیر
 کھیلتا ہے آگ سے مردِ جلیل

اُس جہاں میں ساقی کوثر وہی
 جس کے ملنے پر شہنشاہی ملی
 ان کے قدموں میں تھے مصرعینِ روم
 اس کا دل آلائشوں سے پاک ہے
 خاک کا والی بنا وہ نیک نام
 گر ہے بننا سنگ بنیادِ بہمن
 اس کی خاطر پھر نیا عالم بنا
 ورنہ ہو جائے گی صرف دیگران
 کیوں ہے تو فریادی بیدادِ سنگ؟
 سینہ کو بی ہائے پیہم، تابہ کئے
 لذتِ تخلیقِ دستور حیات
 قوتِ بازو کا بھی اندازہ ہو
 کر بلند آوازہ ربِ جلیل
 تیغ کیا اٹھے پر انداز سے
 ساز کر لیتا ہے خود ہی روزگار
 اس سے لڑ جاتا ہے مردِ باوقار
 کرتا ہے تعمیرِ دنیاے دگر
 صرف اپنی بات پر اڑتا ہے وہ
 اک نئی دنیا کہ جو ہو سازگار
 مر تو سکتا ہے وہ لڑ کر شان سے
 جان سکتا ہے کہ ہے کتنا دلیر
 پھول چن لیتا ہے شعلوں سے قلیل

ممکناتِ قوتِ مردان کا ر
 بستِ ہمت کی نظر سوتے نشیب
 زندگی ہے کوشش و ہمت کا نام
 عقوبتی کو دمِ خستہ سمجھ
 تجھ میں غیرت ہے تو ذلت سہہ نہ تو
 ناتوانی زندگی کی راہزن
 اس کا سینہ خوبیوں سے ہے تہی
 کیا عجب تجھ کو لگالے بات میں
 ناتوانی کو سمجھتا ہے محال
 اہل دانش نے اسے سمجھا نہیں
 ہوشیار را اے مردانا ہوشیارا
 گاہ "مجبوری" کا وہ ڈالے نقاب
 وہ بشکل "عیش سامانی" بھی ہے
 صرف اظہارِ صداقت کے لیے
 ہے یہ 'قوت' ہی جو شرحِ دل کرے
 صاحبِ قوت اگر ہے مدعی
 اس سے باطل میں بھی آئے شانِ حق
 زہر اس کے حکم سے کوثر بنے
 تیرے کندھوں پر امانت کا ہے بار
 ہے صفتِ تیری جو ظالم اور چہول

چشم و گوش و لب اگر رکھے نہ بند

کھوکریں کیوں کھائے مرد ہوشمند



ہیں فقط دشواریوں میں آشکار
 بس اسی کا کام ہے مکر و فریب
 زندگی کو ذوقِ استیلا سے کام
 غیر موزوں شعر کا سکتے سمجھ
 ناتوانی کو 'قتاعت' کہہ نہ تو
 بطن میں اس کے چھپے ہیں مروقن
 کہتی ہے، 'آماس' کو وہ فرہی
 تیرا یہ دشمن ہے تیری گھات میں
 اس کو ہے چہرہ بدلنے میں کمال
 اس کو اصلی روپ میں دیکھا نہیں
 نام اس کے 'رحمِ نرمی' 'انکسار'
 گاہ 'معدوری' کا وہ پائے خطاب
 ایک نام اس کا "تن آسانی" بھی ہے
 مردِ حق مرتا ہے 'قوت' کے لیے
 بر ملا فرقِ حق و باطل کرے
 مانتے ہیں اس کی باتوں کو سبھی
 بن کے 'حق' باطل کرے بطلانِ حق
 خیر کو کہہ دے جو شر تو شربے
 خود کو دو عالم سے بہتر کر شمار
 صرف غیر اللہ تک ہے، یہ نہ بھول

حکایت سید مخدوم علی بھوپری

جن کا مرقہ پیر شیخہ کا حرم
ہند میں آیا وہ مرد نیک نام
نازہ کردی عہد فاروقی کی یاد
جتنے گھر باطل کے تھے ویران تھے
ہو نشہ جیسے شرابِ ناب میں
ان کے رخ سے تھے عیاں اسرارِ عشق
اب سنا تا ہوں میں ان کی داستاں
مرؤ سے لاہور میں وارد ہوا
اس طرح اس نے کیا اُن سے خطاب
سنگ پاروں میں ہوشیہ جس طرح
دشمنوں کے بیچ میں کیسے رہوں؟
کس لیے کہتا ہے جینا ہے محال
پھر سمجھ میں آئے گا جینے کا راز

سید بھوپریؒ، مخدوم ام
توڑ کر رشتے کہستاں سے تمام
حق کی خاطر اُن کا وہ شوقِ جہاد
پاسبانِ عزتِ قرآن تھے
بس گئے وہ اس طرح پنجاب میں
قلب تھا اُن کا جو مایہ دارِ عشق
بند کر کے اک کلی میں گلستاں
چھوڑ کر گھرا اپنا اک مردِ خدا
آکے پیشِ سید والاجناب
”دشمنوں سے میں گھرا ہوں اس طرح
کس قدر جینا ہے مشکل کیا کہوں!
پیرِ دانا نے کہا ”اے خوش خصال
فکرِ دشمن سے تو ہو جا بے نیاز

۱۔ حضرت داتا گنج بخش سید مخدوم علی بھوپریؒ

۲۔ ان کے روضہ مقدسہ پر پیر شیخہ حضرت معین الدین چشتیؒ نے چلہ کشی کی تھی، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

خود کو جب پتھر کرے شیشہ خیال
 ناتواں خود کو جو سمجھے راہرو
 آب و گل سمجھے گا خود کو تابہ کئے
 سرگراں کیوں ہے عزیزوں سے بتا
 سچ کہوں؟ دشمن بھی تیرا یا رہے
 جانتا ہے جو مقاماتِ خودی
 تیرا دشمن پیار کرتا ہے تجھے
 سنگِ رہ خاطر میں لائے مست کیا!
 عزم ہو تو سنگِ رہ بھی ہے فساں
 کھا کے حواں کی طرح سونا بھی کیا!
 جب خودی سے خود کو تو محکم کرے
 گرفتار چاہے تو ہو آزادِ خود
 موت کو سمجھا فراقِ جان و تن!
 کر خودی میں صورتِ یوسفِ قیام
 تو خودی کی سوچ، مردِ کارِ بن
 اب کروں گا فاش میں سیرِ نہاں

اس میں شیشے کی طرح پڑتا ہے بال
 ایک رہزن لوٹ لے گرچہ ہوں کو
 تیری گل میں شعلہ سینا بھی ہے
 کس لیے کرتا ہے دشمن کا گل؟
 اس کے دم سے رونقِ بازار ہے
 شکر کرتا ہے کہ دشمن ہے قوی
 خواب سے بیدار کرتا ہے تجھے
 سیل کے آگے بلند و پست کیا!
 تیز رکھتی ہے جو خنجر کی زباں
 تو نہیں محکم تو یہ ہونا بھی کیا!
 چاہے تو بزمِ جہاں برہم کرے
 گر بقا چاہے تو ہو آبادِ خود
 موت تو ترکِ خودی ہے جانِ من!
 ہے اسیری سے شہی بس ایک گام
 مردِ حق بن، حاملِ اسرارِ بن
 تجھ کو ادروں کی سنا کر داستان

”خوشتر آں باشد کہ بر دلبران
 گفتہ آید در حدیث دیگران“

۱۔ شعر مولا ناروم، ترجمہ: ”اچھا یہی ہے کہ دلبروں کے راز دوسروں کے قصوں میں چپا کر (کنایہ)

بیان کیے جائیں“

پیاسے پرندے کی حکایت

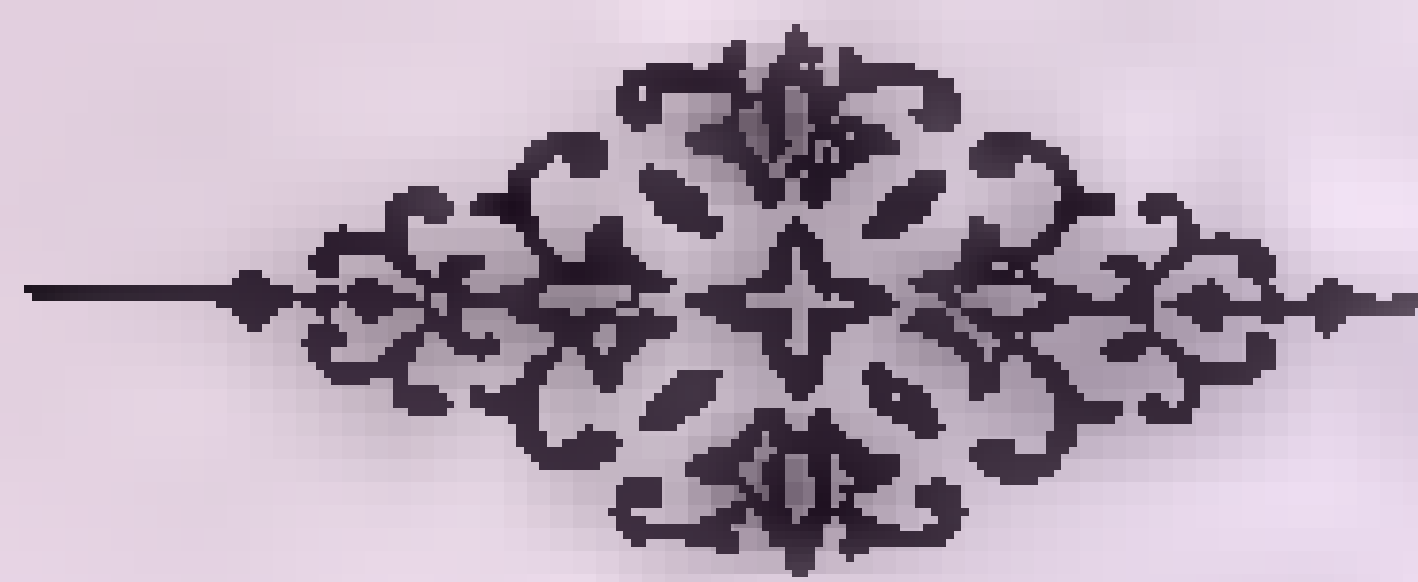
اڑ رہا تھا ہر طرف دیوانہ وار
چمچاتی، جیسے میسرے کی آلی
وہ سمجھ بیٹھا کہ ہے پانی کی بوند
تاکہ اس کی چونچ ہو پانی سے تر
تیز کر مجھ پر نہ منتار ہو بس
تجہ میں اتنا ہوش بھی باقی نہیں
توڑ سکتا ہوں میں منتارِ طیور
پیٹ میں اس کے اتر کر رہوں
ہو گیا بے چین، ٹوٹی اس کی آس
اڑتے اڑتے اک طرف کو مڑ گیا
قطرۂ شبہم پہ جو تھا پھول پر
کانپتا تھا پھر بھی اس کے قہر سے
سیر کرتا آگیا ہو پھول پر
سیرِ ہستی سے مگر نا آشنا
جو ٹپکنے کے لیے ہو بقرار

اک پرندہ پیاس سے تھا بقرار
اُس نے دیکھی ایک ہیرے کی کنی
جھٹ سے اس کی عقل نے لی آنکھ بوند
پھر وہ جھپٹا ریزۃ الماس پر
بولا ہیرا "اے گرفتار ہو بس
میں کوئی پانی نہیں، ساقی نہیں
مارتا ہے چونچ کیوں اے بے شور
میں تو انسان کے لیے بھی قہر ہوں
جب نہ طاؤر کی بھی ہیرے سے پیاس
وہ وہاں سے آہ کر کے اڑ گیا
پھر اچانک پڑ گئی اس کی نظر
مستعار اس کی چمک تھی مہر سے
جیسے اک تارا فلک سے ٹوٹ کر
آنکھ جس کی ہو تماشا آشنا
جیسے اک آنسو سیرِ مرگازنِ یار

جب وہ طا تر بن کے خطرہ آگیا
 تو بتا، دشمن سے بچنا ہو اگر
 پیاس سے جب مرغ بے قابو ہوا
 قطرہ ترمی کے سبب نابود تھا
 تو خودی سے ہو کے غافل، کم نہ بن
 تو جو پختہ صورت کہسار ہو
 خود کو محکم کر لے تو ایجاب سے

جھٹ سے اس کے منہ میں قطرہ آگیا
 قطرہ شبیم ہے اچھایا گہرا
 دوسروں کی جان کا دشمن ہوا
 چونکہ ہمیرا سخت تھا، موجود تھا
 ریزہ الماس بن، شبیم نہ بن
 حاملِ صمد ابر دریا بار ہو
 جم کے بن جاسیم، تو سیما ب سے

پھر خوشی سے چھپر کر تارِ خودی
 آشکارا کر دے اسرارِ خودی



ہمیرے اور کوئلے کی حکایت

رہنے والے دونوں ہم اک ساتھ کے
ہے ہماری مشترک اصل وجود
ہے رسائی تیری کیسے تاج تک
پہنچ تو یہ ہے زیست سے یزار ہوں
میں ہوں ارزاں، نرخ بالا ہے ترا
میں خزف ریزہ یہ کیا انصاف ہے
آگ میں مجھ کو جلاتے ہیں سبھی
جب ہے تجھ کو میری حالت کی خبر
مجھ سے ہوتی ہیں جدا چنگاریاں
تیرے ہر ہسلو کا جلوہ ہے نیا
اور کہیں ہے خاتمِ قیصر میں تو
خاکِ پختہ ہو کے بنتی ہے نگین
ڈرے لڑتے ہیں دلِ صد چاک میں

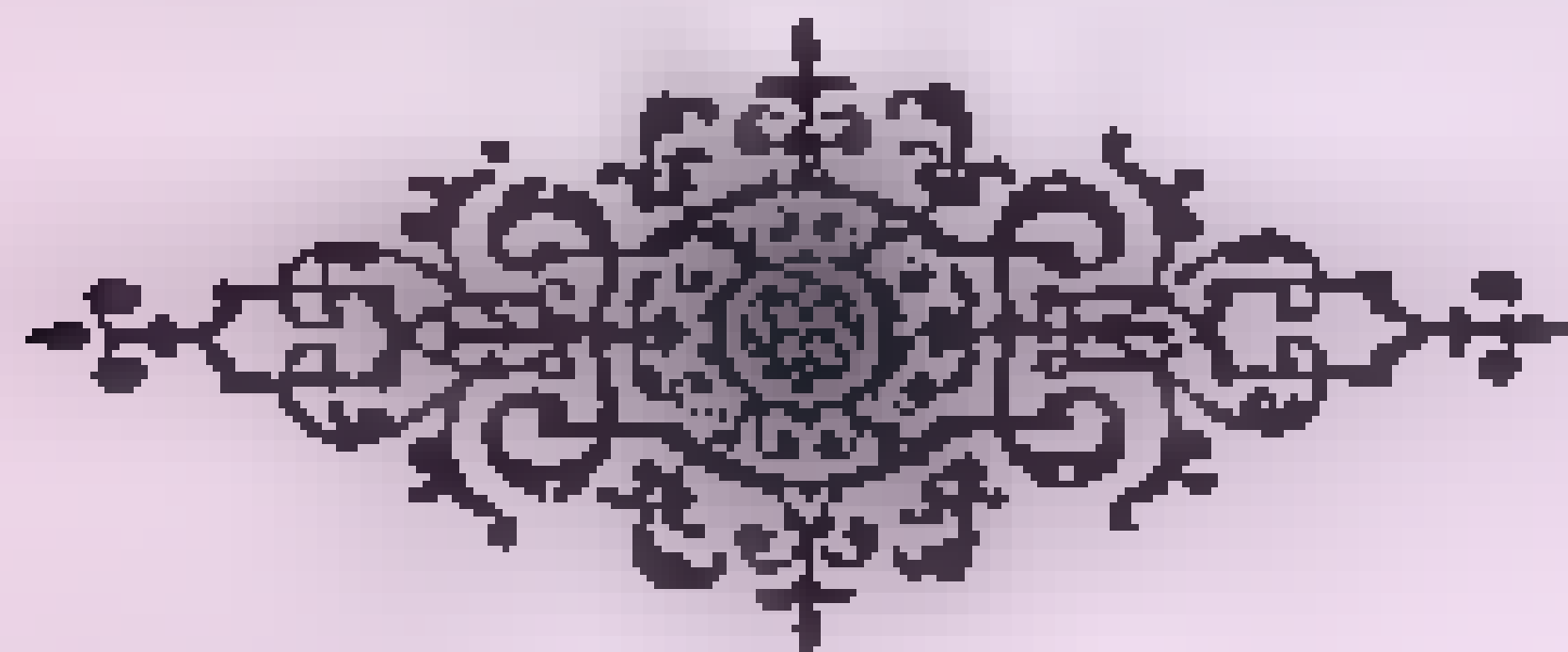
کوئلے نے یہ کہا الماس سے
ایک جیسی ہے ہماری ہست و بود
میں تمہیں سمجھا ہوں پھر یہ آج تک
اور میں اتنا ذلیل و خوار ہوں
رنگ تیرا صاف کالا ہے مرا
تیرا چہرہ شیشہ شفاف ہے
مجھ کو ٹھوکر میں اڑاتے ہیں سبھی
کیوں نہیں روتا ہے میرے حال پر
میں بکھر جاتا ہوں بن بن کر دھواں
اور تارے کی طرح تیری ضیا
ہے کہیں پردہ نشین خجبر میں تو
تب کہا الماس نے "اے نکتہ ہیں
جنگ ہوتی ہے بیٹوں خاک میں

تاج کے پاسنگ پھر بنتا ہوں میں
 مجھ میں رنگارنگ جلوے مثلِ نور
 پہلے سنگ سخت پھر الماس بن
 ہے انھیں کے دم سے دنیا مستزیر
 پھر بھی وجہِ رشک نہ افلاک ہے
 بوسہ گاہِ اسود و احمر ہے وہ

سخت مثلِ سنگ پھر بنتا ہوں میں
 پختگی سے میرے پیکر میں ہے نور
 روز و شب مجھ سا تپا کر جان و تن
 ہیں یہاں جو سخت کوش و سخت گیر
 سنگِ اسود گر چہ مشتِ خاک ہے
 مرتے میں طور سے برتر ہے وہ

ہے صلابت آبروئے زندگی۔

نا توانی، بے کسی، ناپختگی۔



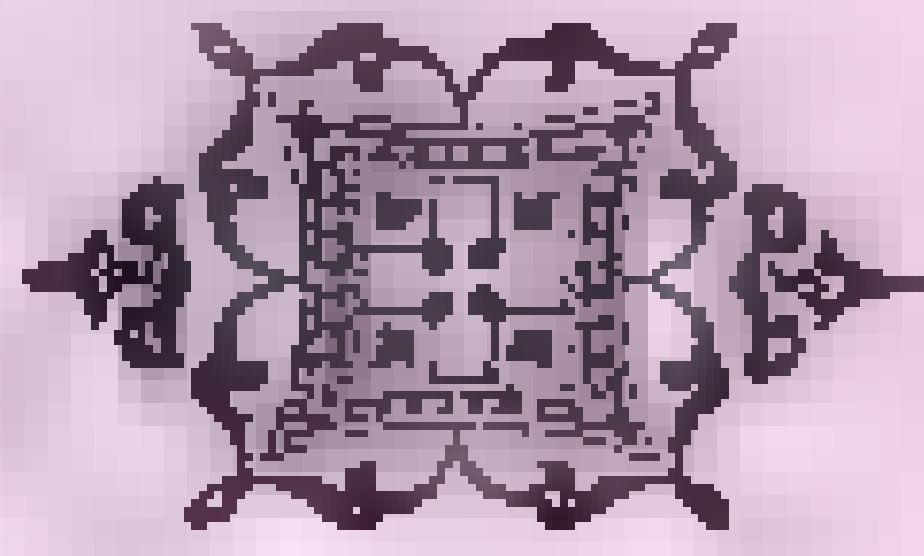
حکایت شیخ و برہمن

تھا شناسائے روایاتِ قدیم
عارفانِ حق کا تھا دل سے مرید
وہ فلک پیم، فلک بردوش تھا
مہر و مہ بھی اس سے کرتے تھے گریز
تھائے عرفاں سے خالی اس کا جا
فکر کے میدان میں سرگشتہ رہا
کرنہ پایا طائرِ معنی اسیر
قلب ہستی کی نہ دیکھی تھی جھلک
آگیا اک شیخِ کامل کے حضور
سن رہا تھا غور سے وہ برہمن
آسمان پر ڈالنے والے کمند
حق ادا کرنا ہے تجھ کو خاک کا
فکر کو رکھنے کا بالائے فلک !

اک برہمن تھا بنارس میں مقیم
ماہرِ حکمت تھا وہ مردِ فرید
ذہن اس کا تیز و ندرتِ کوشش تھا
شعلہ فکر اس کا اتنا گرم و تیز
فکر میں اس کی جو تھا سودائے غا
مدتوں راحت سے برگشتہ رہا
پر خرد کے دام میں وہ مردِ پیر
گرچہ تھا دانائے اسرارِ فلک
ایک دن لے کر وہ قلبِ نامبور
جب مخاطب اس سے تھے شیخِ زمین
شیخ بولے " اے حکیم سر بلند
اے کہ دلدادہ ہے تو افلاک کا
بن میں یوں آوارہ پھرنا، کب ملک

آ زمیں پر پھر سے اے گردوں نورد
 میں نہیں کہتا کہ بت بیزارین
 اپنی تہذیب کہن سے ملنے نہ ہوڑ
 گر ہے جمہیت بملت استوار
 تو کہ اپنے کفر میں کامل نہیں
 دُور تو آزر، میں ابراہیم سے
 ہم جو دونوں عشق میں کامل نہیں
 اب بھی دونوں بر سر منزل نہیں

ہم میں جب روشن نہیں شمع خودی
 یہ فلک پیما ئیاں کس کام کی



مرکالمہ گنگا و ہمالہ

کوہ کے دامن میں جب کوئی نہ تھا
 "ندیوں کی مالا پہنے" یخ بدوش
 گو بلندی میں بہت مشہور ہے
 جب تجھے عادت پڑی آرام کی
 زندگی میں جب نہ ہو لطیفِ خرام
 کوہ نے دریا کا جب طعنہ سنا
 "میرے جو ہر تیرے آئینے میں ہیں
 تیرے چلنے میں ہے سامانِ فنا
 ہستی قلزم میں کھو جاتی ہے تو
 اپنی کمزوری پہ یوں نازاں نہ ہو
 جانتا ہوں میں کہ گردوں زاد ہے
 مثلِ بوا دوشِ ہوا پیروں نہ گھوم
 زندگی اپنی جگہ بڑھنے کا نام
 ہو گئیں صدیاں یہیں پر ہوں کھڑا

ردِ گنگا نے ہمالہ سے کہا
 اے ہمالہ تو ازل سے ہے خموش
 دو قدم چلنے سے بھی معذور ہے
 رفعت و شوکت ترے کس کام کی
 عیشِ دو عالم بھی ہوتا ہے حرام
 آکے غصے میں وہ یوں گویا ہوا
 تجھ سے سو دریا مرے سینے میں ہیں
 بہہ رہی ہے لے کے ارمانِ فنا
 اس سے مل کر ایک ہو جاتی ہے تو
 ہوا مگر تجھ سا کوئی ناداں نہ ہوا
 تجھ سے بہتر ساحلِ افتادہ ہے
 پھول بن کر اپنی ہی ڈالی پہ جھوم
 اپنے بل بوٹے پہ بے چڑھنے کا نام
 جانتی بھی ہے کہ ہوں کنت بڑا!

بڑھتے بڑھتے ہوں فلک کا ہم رکاب
 کھو گئی ہستی سمندر میں تری
 میری نظریں میں ہیں اسرارِ فلک
 دیکھ سونہر سستی پیہم کا اثر
 ”مجھ میں پھترا اور پھتر میں ہے آگ
 بوند سی کیوں گر رہی ہے فاک پر
 یا صدوت میں جا کے گوہرِ یزہ بن
 بھاپ بن کر یا سبک رفتار بن
 دے سمندر کو تو طوفانوں کی فوج
 گود میں میری ثریا محو خواب
 چومتا ہے چاند پیشانی مری
 میں سنا کرتا ہوں پردازِ ملک
 جمع مجھ میں لعل و الماس و گہر
 آگ وہ جس سے نہیں پانی کو لاگ
 بن کے اک طوفاں سمندر سے گزر
 گوشِ دلبر کے لیے آویزہ بن
 ابرِ برق انداز و گوہرِ یار بن
 ہو تری مرہون اس کی موج موج

ہو سمندر بھی ترا درِ یوزہ گر
 اپنا سر دکھ دے وہ تیرے پاؤں پر



۱۷

اسلام اور جنگ

رنگ بھر دل میں تو اس کی چاہ کا
تو اے مسلم، مسلم صادق نہیں
تابع حق مردِ عاشق کا شعار
اس کا آنکھیں بند کرنا کھولنا
اس کی مرضی مرضی مولیٰ میں ضم
اس کی اِلا اللہ پر ہر دم نگاہ
سب سے بہتر رنگ ہے اللہ کا
بلکہ کافر ہے اگر عاشق نہیں
اس کا طرزِ فکر، اس کا طرزِ کار
اس کا کھانا پینا ہنسنا بولنا
عام لوگ اس بات کو سمجھیں گے کم
ہے عوام الناس کے اوپر گواہ

۱۔ اس آیت قرآنی کی طرف تلمیح ”وَمِنْ أَحْسَنِ مِمَّنِ اللَّهُ صِفَةً“ (کہہ دو کہ) اور اللہ سے

بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے؟

۲۔ شعر ۳ تا ۵ میں سورۃ انعام کی اس قرآنی آیت کی ترجمانی ہے ”قُلْ إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ
وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ الخ (کہو بے شک میری نماز، میرا حج، میری زندگی اور میری موت

سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے)

۳۔ شعر ۴۔ سورۃ بقرہ کی آیت (۱۲۲) میں آیا ہے ”وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكَ مِمَّا رَفَعْنَا نُسُكًا لِّعِبَادِنَا
عَلَى النَّاسِ وَيَكُونُوا رِئَاسًا لِّمَنْ يَشَاءُ“ (اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین (مستوازن) امت بنایا

ہے تاکہ تم لوگوں پر لواد بنو اور رسولِ خدا تم پر گواہ بنیں)۔ مذکورہ اشعار میں اس آیت مقدسہ کی طرف تلمیح ہے۔

جن کی سچائی ہے بالائے گماں
تو عدوئے ظلمتِ اعمال بن
تو خدا ترس و خدا اندیش بن
بس اسی تک ہر قدم محدود ہو
جنگ ہو اللہ کے حق میں تو خیر
جنگ ہے پھر قوم کے حق میں گزند
ذکر سے جن کے کھلے دل کی کلی
ذکر حق سے تھے چمن اندر چمن
اہل ایماں کا حق، ان کا مزار
تھا مریدوں میں شہ ہندوستان
ملک گیری کی ہو س کا تھا شکار
تیغ اس کی کہتی تھی ہل من مزید
شاہ کو آیا چڑھائی کا خیال
تا کہ اس کے حق میں فرمائیں دعا
کرتے ہیں مسلم بزرگوں سے رجوع
سر جھکائے شیخ تھے لیکن خموش
چند درہم لے کے اٹھا اک مرید
کیجئے احقر کا نذرانہ قبول

اس کے شاہد ہیں نبیؐ انس و جاں
قال سے صرف نظر کر حال بن
خسروی بلوکس ہیں درویش بن
ہر عمل میں قرب حق مقصود ہو
صلح بھی شر ہے جو ہے مقصود غیر
تیغ سے جب ہو نہ نام حق بلند
حضرت شیخ میاں مسیر دلی
تھے طریقِ مصطفیٰؐ پر گامزن
مرجع ہر مرد و زن ان کا مزار
ان کے دیپر چہہ فرنا آسمان
شاہ پر طاقت کا چھایا تھا خمار
تھی لہو کی پیاس کچھ اتنی شدید
جب دکن پر تھا جو جھگڑوں سے نکال
شیخ کے دربار میں حاضر ہوا
جب بھی کوئی کام کرتے ہیں شروع
تھے سبھی بہر دعا مرتاپا گوش
قفل خاموشی کی پھر بن کر کلید
شیخ سے کی عرض "اے شانِ رسولؐ

اے ان اشعار میں وقایع فی سبیل اللہ..... لایحیبت المعتدین سورۃ بقرہ کی

آیات (۱۹۳ تا ۱۹۰) کی تشریح ہے (اور ہم انہیں اللہ کی راہ میں قتل کرو...) (مگر زیادتی نہ کرو)۔ خدا

زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ علامہ حضرت شیخ میاں میر عمر سندھ کے مشہور ولی۔

رونگوں کی بات ہی کیا ہے حضور
 شیخ بولے کر کے سلطان پر نظر
 ہے کھڑا در پر لگائے کب سے اس
 بات الٹی ہے مگر کر لے یقین
 بھوک سے رہتا ہے مضطر اس قدر
 آگ اس کی پیٹ کی یہ الاماں
 قحط اور طاعون پھیلاتا ہے یہ
 خلق اس کی مفاسی سے خوار ہے
 اس کی سلوت، دشمن اہل جہاں
 خود فریب اتنی ہے اس کی فکر خام
 لشکر شاہی ہو یا فوجِ غنیم
 آتشِ جانِ گدا جو عِ گدا

پر یہ محنت کی کمائی ہے ضرور
 "مستحق وہ ہے" اسے خیرات کر
 وہ گدا پہنے ہوئے شاہی لباس
 اپنا یہ سلطان ہے مفلس ترین
 ہے جہاں بھر کے نوالوں پر نظر
 جس نے خاکستر کیے کتنے مکاں
 اک بلا عالم کے سرلاتا ہے یہ
 ہے ضعیف اور خود ضعیف آزا ہے
 لوٹ لیتا ہے یہ رہزن کارواں
 لوٹ کو "تسخیر" کا دیتا ہے نام
 دونوں تیخِ جوع سے اس کی دو نیم
 جوعِ سلطان ملک و ملت کی فنا

بہرِ غیر اللہ جو کرتا ہے وار
 تیخ کا اپنی ہی ہوتا ہے شکار



فرمودات میرنجات المعروف بہ پایا سحرانی

جس گھڑی مٹی سے تو پیدا ہوا
 کر خودی محکم، بفتا انجام بن
 اُس خودی کو جو ہے تجھ میں ضو نشان
 منفعت دے گا بہت، سودا ترا
 ہو کے زندہ، موت سے ڈرتا ہے تو
 جانتا ہوں برگ و سائر زندگی
 پہلے خود دریا میں غوطہ مارنا
 راکھ میں اپنی چھپانا کچھ شرر
 جس کے بننے میں لگیں چالیس سال
 اپنے ہی شعلے کا کرتارہ طواف
 خود کو سمجھے گا اگر بیت الحرام
 اُڑ کے جذب خاک سے کر جا فرار
 تو نہیں گر طائرِ گردوں گزر

تھا خودی کا تیسری گردن پر جوا
 قطرہ ہونے پر بھی بحرِ آشام بن
 کر کے مستحکم تو ہو جا جاوداں
 پیڑ بن جائے گا یہ پودا تیسرا
 میں ترے قرباں، غلط سمجھا ہے تو
 اس لیے سن مجھ سے رازِ زندگی
 پھر نکل کر خود سے، خود پر وارنا
 شعلہ بن کر خیرہ کرنا ہر نظر
 شعلہ بن کر اس مکان کو پھونک ڈال
 گر چہ ہے وضع زمانہ کے خلاف
 غیر کا پھر تو نہیں ہو گا غلام
 مثلِ طائرِ رہ ہوا میں برقرار
 کوہ پر پھر آشیاں بندی نہ کر

تو اگر ہے شائق کسب علوم سن لے مجھ سے یہ پیام پیرِ روم
 "علم را بر تن زنی مارے بود"
 علم را بر دل زنی یارے بود"

مجھ سے اب سن قطعہ اخوند روم جب حُلب میں تھا وہ استاذِ علوم
 تھا وہ زنجیری توجیہاتِ عقل تجھی اسے گھیرے ہوئے ظلماتِ عقل
 تھا ابھی میگاہ سینائے عشق ہاتھ میں اس کے نہ تھا مینائے عشق
 جس گھڑی بابِ تشکک کھولت سننے والوں کا عقیدہ ڈولتا
 روشنی جب ڈالتا اشراق پر عقلِ انسانی کو رکھتا طاق پر
 قولِ مشائیں کی گرہیں کھول کر وہ لٹاتا علم و دانش کے گہر

لے ترجمہ: "اگر علم کو تن (مادی قوانین) کے لیے استعمال کرے گا تو وہ (تیرے حق میں) سانپ بن جائے گا در اگر اسے دل (یعنی روحانی مقاصد) کے لیے استعمال کرے گا تو یہ علم تیرا دوست بن جائے گا۔
 لے لے لے ان اشعار میں فلسفۃ الہیات کی ان چند اہم شاخوں کا ذکر ہے جن میں مولانا کو دستگاہ تھی۔
 تشکک (SCEPTICISM) کے پیر و عقل و لائل کی بنیاد پر حصولِ علم کے امکانات کی نفی کرتے ہیں اور الہامی مذاہب کی صداقتوں کو بھی شک کی نندوں سے دیکھتے ہیں۔ مولانا الہیات کی اس شاخ کے بیچ و خیم سے واقف تھے۔ اسی طرح وہ اپنے مکتب میں علم اشراق اور علم مشائیں کا بھی درس دیتے تھے۔ حکمائے سلف کا ایک گروہ دروں مینی کے ذریعے مابعد اسطیغاتی حقائق جاننے کا دعویٰ کرتا تھا اس مسلک کو اشراق (لغوی معنی روشنی دینا) یا اشراقیت کہتے ہیں۔ اس کے برعکس یونانی فلسفیوں کا ایک گروہ جو اسطو کے شاگردوں پر مشتمل تھا حقیقت امتیاز کی دریافت باہمی مباحثوں اور عقلی دلائل کے ذریعے کرتا تھا۔ وہ مشائیں کہلاتے ہیں۔ علم اشراق و علم مشائیں میں بعد المشرقین بے یکن مولانا ان تمام علوم پر عبور رکھتے تھے اور ان کا درس دیتے تھے۔ ذوق کا یہ شعرا پر صادق آتا ہے۔
 سہ کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں پیش روی کبھی لے جاتا تھا اشراقیوں پر میں بوقت

آس پاس اس کے تھا انبارِ کتب
 کر رہے تھے شمس از حکم کمال
 آیا جب مکتب میں وہ مردِ خدا
 ”بحث کیسی ہے؟“ یہ قیل و قال کیوں؟
 مولوی بولا ”نہیں جس فن میں طاق
 تو نہیں سمجھے گا کیا ہے قیل و قال
 ہے ترے ادراک سے یہ بالا تر
 دیکھ کر رومی کا طرزِ ناز و
 شعلہ بار آنکھوں سے اک بجلی گری
 خرمِ ادراک سارا جل گیا
 مولوی سمجھانہ یہ اعجازِ عشق
 بولا ”یہ تو نے لگائی آگ کیوں؟“
 شیخ بولا ”تو خرد کا ہے غلام
 تو کہ ہے دیوانہ قیل و قال کا
 پاس تیرے عقل کا مقیاس ہے
 کیا ہے حکمت مغز ماری کے سوا
 آگ پیدا کر خس و خاشاک سے
 سوزِ دل سے علم کا اتمام ہے

تھی لبوں پر شرحِ اسرارِ کتب
 جستجوئے مکتبِ ملا جلال
 درسِ رومی دیکھ کر اس نے کہا
 یہ قیاس و وہم و استدلال کیوں؟
 کس لیے اس کا اڑاتا ہے مذاق؟
 بے سرو پا و سو سے دل سے نکال
 اس بلندی پر نہیں تیرا گزر
 جان تبریزی سے اک شعلہ اٹھا
 جس میں جل کر خاک بھی شعلہ بنی
 دفتر کا واک سارا جل گیا
 تھا ابھی بیگناہ اندازِ عشق
 دفترِ حکمت سے اتنی لاگ کیوں؟
 ذوق و وجد و حال سے کیا تجھ کو کام
 حال کیا سمجھے گا ذوقِ حال کا
 کیمیائے سرخ میرے پاس ہے
 پائے گا کیا برف باری کے سوا
 شعلہ کر تعمیر اپنی خاک سے
 ترکِ آفل معنیِ اسلام ہے

بندِ آفل توڑ کر آزاد بھتا

ابنِ آذر آگ میں بھی شاد تھا

وہ ہے زندانِ منظر ہر کی مکیں
بن گئی ہے اپنے ہی حق میں بلا
آگ اس کی مثلِ لالہ سرد ہے
عشق سے بیگانگی ہے اس کی خواہ
عشق، جالینوس بیمارِ عقل
سارا عالم ساجد اور مسجود عشق

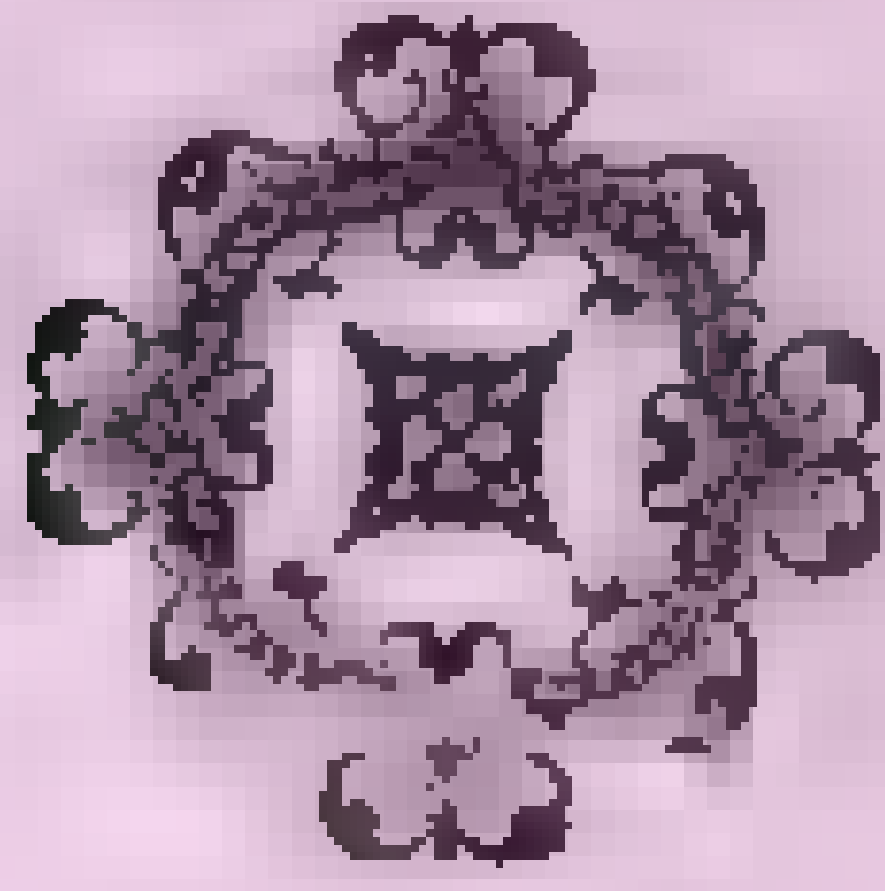
عقل تن آساں میں ہے باتوں کا زور
عشق کی راتوں میں ہے یارب کا شور

ہے حدودِ حس کے اندر جاگزیں
اپنا تختہ اور اپنا ہی گلا
جانے کب ٹوٹے کہ برگِ زرد ہے
اس کو رکشتی ہے پریشاں جستجو
عشق سوداِ بیشہ میں ثواری عقل
سومناں عقل کا محمود عشق

دو سروں کے فتد کو سمجھا ہے بلند
ہو رہا ہے سن کے خوش اوروں کی لئے
تیرا تن ہے مایہ دارِ جانِ غیر
جل گئی مسجد شرارِ دیر سے
کب شکارِ ناوکِ صیاد تھا
بچہ نہ جائے تو کہیں مثلِ شرار
وحدت گم گشتہ کے پھر دیکھ خواب
کرنہ دے کافر تجھے ترکِ شعار
کفر ہنستا ہے ترے اسلام پر
چل پڑا ہے دیر کو شیخِ حرم
ہیں گلی کو چوں کے لڑکوں کا مذاق
دل ہے اصنامِ ہوس کی خانقاہ
بن گئے سوداگرانِ دیں فروش
قوم کی ان کو نہیں اصلا خبر

اپنے سروِ قد سے کر کے آنکھ بند
خود سے خالی کر کے خود کو مثلِ نئے
اے گدائے ریزہ چینِ خوانِ غیر
بچہ گیا مسلم چراغِ غیر سے
جیسے ہی آہوئے حرم آزاد تھا
ڈر ہے اپنے شعلے سے ہو کر فرار
اے امینِ حکمتِ ام الکتاب
چھوڑ بیٹھا اپنی ملت کا حصار
انحصارِ کعبہ اور اصنام پر
دشمنِ اسلام ہے عشقِ صتم
جو بزرگِ قوم ہیں پیری میں طاق
مٹ گیا سینے سے عشقِ لالہ
چھوڑ کر گیسو ہمارے خرقہ پوش
ساتھ کرتے ہیں مریدوں کے سفر

کم نظر ہیں، دور بینوں میں نہیں دل کی دوست ان کے سینوں میں نہیں
 صوفی و ملا ہو سس کا ہیں شکار ملت بیفمانے کھویا اعتبار
 واعظان قوم ہیں ملت فروش مفتی دین متیں، حرمت فروش
 دوستو! اب کیا کریں تدبیر ہم
 نکلا اپنا پیر شیدا ئے صنم



الوقت سیف

تھے ہمارے ایک عالم شافعی
 ہو سدا سر سبز ان کی خاک پاک
 اے خوشا ان کا خیال فکر خیرا
 زندگی سے ربط اس شمشیر کا
 ہاتھ میں لے جو یہ شمشیر کریم
 جو بھی یہ شمشیر رکھے اپنے پاس
 ضربت کاری سے جس کی سنگ آب
 ہاتھ میں موسیٰ کے یہ شمشیر تھی
 جس سے قلب بحر احمر چاک تھا
 دست حیدر میں یہی خیر شکن
 تو نے سمجھا روز و شب کا یہ سفر
 تو اسیرِ دوش و فردا ہے تو خیر
 اندرون جس ہو جب سے ابر
 لے کے تو پیانا لیل و نہار
 تو بنا کر وقت کو زنا و دوش
 کہہ بیا ہو کر بھی مثلِ گِل بنا

واقفِ سرِ زمانِ واقعی
 فکر کی دنیا ہے ان سے تابناک
 جس کی رو سے وقت ہے شمشیرِ تیز
 جیسے رشتہ ہو کہاں سے تیر کا
 ہاتھ ہو روشن تر از دستِ کلیم
 چھو نہیں سکتے اسے خوف و ہراس
 خشک کر دے بحر کو جس کا عتاب
 ہاتھ میں شمشیر کیا تقدیر تھی
 ایک دریا خشک ہو کر خاک تھا
 نعرۂ حق بن کے تھی مَرَحَبِ فُگن
 گردشِ گردوں ہی کا ہو گا اثر
 ورنہ کہتا تجھ سے آ کر دل کی سیر
 وقت ہے تیری نظریں اک بکیر
 ناپتا رہتا ہے طولِ روزگار
 بن گیا مثلِ بتاں باطل فروش
 سرِ حق تھا، مایہ باطل بنا

تو اگر مسلم ہے یہ زمانہ بھینک
 روشنی دیدہ ابرار بن
 جب ہے تو ناواقف اصلِ زماں
 اے اسیرِ وقت! بن شہبازِ وقت
 کائناتیں سر کرے رفتارِ وقت
 گردشِ خور میں نہیں اصلِ زماں
 بزمِ ماتم میں اگر ہے آہِ وقت
 وقت کو مثلِ مکاں پھیلادیا
 مثلِ بویوں چھوڑ کر اپنا چمن
 اول و آخر نہ دیکھے ہوں بھلے
 اس کا غراں ہو تو زندہ زندہ تر
 جو وبالِ دوش ہے وہ بار بھینک
 شمعِ بزمِ ملتِ احرار بن
 کیا کہوں کیا ہے حیاتِ جاوداں
 لیٰ مع اللہ میں چھپا ہے رازِ وقت
 زندگی اک مظہرِ اسرارِ وقت
 اس کی قسمت میں فنا یہ جاوداں
 بزمِ عشرت کی بھی کھولے راہِ وقت
 دوش و فردا میں دولیٰ! یہ کیا کیا؟
 ہو گیا خود ہی گرفتارِ زمن
 وقت دل کی گود میں پھولے پھلے
 اس کی ہستی صبح سے تابندہ تر

لازم و ملزوم دہر و زندگی
 ”لا تسبوا الدہر“ ہے قولِ نبیؐ

۱۔ سارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف ”لَا تَسْبُوْا الدَّهْرَ“ (میرے لیے ایک خاص) وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب میں خدا کے حضور میں ہوتا ہوں جہاں تک کسی نبی مرسل و مقرب فرشتے کو بھی رسائی نہیں ہوتی) اقبال کی نظر میں یہ وقت وہ زمانہ واقعی ہے جو زمان متسلسل سے مختلف ہوتا ہے جسے ہم برساتِ امروز و فردا سے ناپتے ہیں۔
 ۲۔ ”لا تسبوا“ دہر کے معنی ہیں۔ زمانے کو دشنام نہ دو۔ وہ حدیث جس کا ذکر شعر میں آیا ہے تقصیفِ الفاظ کے ساتھ ملتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

”لا تسبوا الدہر فان اللہ هو الدہر“ (زمانے کو کالی مت دو کیونکہ خدا ہی زمانہ ہے)

یعنی زمانہ خدا کے تصرف میں ہے اور کسی کی ایک شے ہے اقبال اس حدیث کی روشنی میں وقت کو خدا اور خدا کو وقت سے تعبیر کرتے ہیں۔

سن لے مجھ سے ایک نکتہ مثلِ در
عبد کو کرتے ہیں گم لیل و نہار
عبد کے بس کے نہیں ہیں جان و تن
عبد ہے مرغِ اسیر صبح و شام
سینہِ تحر ہے مگر تازہ نفس
عبد کی نظروں میں فطرت رائیگاں
بے دلی سے وہ کرے اک جا قیام
جبکہ حر ہے خالقِ لیل و نہار
اس کی فطرت پاک ہے تکرار سے
عبد کے حق میں زماں زنجیر ہے
ہمتِ تحرین کے قدرت کی مشیر
اُس کے ہیں ماضی و مستقبل بھی حال
میرے اس دعوے میں ہو چاہے تضاد
کیسے معنی تک ہو لفظوں کا گزر
رمزِ معنی ماروائے حرف و صوت
دل میں پایہ نکتہ غیب و حضور

نغمہ خاموش چھیڑے سازِ وقت

ڈوب جادِ دل میں کہ پائے رازِ وقت

وہ بھی کیا دن تھے کہ سیفِ روزگار
دینِ حق کی آبیاری ہم نے کی
اس کے پھر عقیدہ کشا بھی ہم رہے
ہم پرانے میکروں کو لوٹ کر

تاکہ سمجھ امتیازِ عبد و حر
اور مردِ حر میں گم ہے روزگار
روز و شب سے اپنا بتا ہے کفن
لذت پر واز ہے اس پر حرام
طائرِ ایام کا بن کر قفس
وارداتِ دل سے غایِ اک تھاں
عبد کے ہیں بے تغیر صبح و شام
دمبدم تو آخرین و تازہ کار
دائرہ اس کا نہیں پرکار سے
اس کے لب پر شکوہ تقدیر ہے
حادثوں کو کرتی ہے صورت پذیر
حر کے اک پل میں ہزاروں ماہ و سال
ہے مرا دعوئی مگر پُر اعتماد
اس لیے معنی پر رکھ اپنی نظر
حرف میں ڈھلنا ہی ہے معنی کی موت
دیکھ دل میں رمزِ ایام و مرور

تھی ہمارے ہاتھ میں آموزگار
اس جہاں کی پردہ داری ہم نے کی
خاک کے بخت رسا بھی ہم رہے
سب پرانی بندشوں سے چھوٹ کر

ہم صداقت کے لیے جیتے رہے
 تو ہے خرمن کا ہمارے خوشہ چیں
 ہے ہماری مفلسی پر طعنہ زن
 دور چلتا تھا ہمارے جام کا
 ہیں ہمارے دشت کا گرد و غبار
 ہم نے اٹھا ہے زمانے کا ورق
 کر دیا دنیا کو ہم نے محترم
 ہم نے اس کے رزق کی تقسیم کی
 ہم فقیر اب بھی گئے گزرے نہیں
 پھر بھی ہم مست سے پندار ہیں
 ہے دو عالم کو ہمارا اعتبار
 ہم اٹھاتے ہیں کسی دلبر کے ناز
 کیونکہ ہیں مقصود کاف و نون ہم
 آج بھی ہم برق کی جائے پناہ

بادۂ حق خم بہ خم پیٹتے رہے
 اٹے کہ دنیا ہے ترے زیر نگیں
 بادۂ نخوت سے تو ہو کر مگن
 تھا کبھی سکھ ہمارے نام کا
 عصرِ نو کے جلوہ ہائے پربہار
 کر کے دنیا میں بلند آوازِ حق
 اپنی مٹی سے بنا کر سو حرم
 حق نے اقرار کی ہمیں تعلیم دی
 گو نہیں ہیں صاحبِ تاج و نگین
 تیری نظروں میں اگر چہ خوار ہیں
 ہم کو حاصلِ لالہ کا اعتبار
 ہو کے فکر میں و آں سے بے نیاز
 وارثِ موسیٰ ہیں ہم ہارون ہم
 آج بھی روشن ہیں ہم سے مہر و ماہ

آج بھی ہم جلوہ گاہِ ذاتِ حق
 ہستی مسلم میں ہیں آیاتِ حق



۲۰

دعا

اے دل آرام جہاں، جان جہاں
نبضِ جاں چلتی ہے تیرے فیض سے
راہ میں تیری، اے مقصودِ حیات!
پھر ہمارے سینے میں آباد ہو
پھر طلبِ کرہم سے ننگِ دنام کو
آج ہم رسوا سرِ یازار ہیں
روئے زریا پر نقابِ اپنی نہ ڈال
چشمِ بخواب و دلِ بیتاب دے
وہ نشانی پھر اتار اے سرِ دیں
کوہِ آتش خیز کر اس کاہ کو
رشتہ وحدت جو ہاتھوں میں نہیں
ہم پھڑک کر کارواں سے اک ہجوم

دور ہم سے کیوں ہے اے نزدیکِ حال
شمعِ جاں جلتی ہے تیرے فیض سے
موت بھی ہوتی ہے محسوسِ حیات
تاکہ تسکینِ دلِ ناشاد ہو
پختہ پھر کر دے مزاجِ خام کو
تو گراں قیمت ہے، ہم نادار ہیں
عام کر دے عشقِ سلمان و بلالؓ
پھر سے ہم کو فطرتِ سیما دے
جس نے دشمن کی جھکادی تھی جبیں
پھونک ڈالے تاکہ غیر اللہ کو
کتنی گرہیں ایک دھلگے میں پڑیں
ہو گئے ہیں منتشر مثلِ نجوم

۱۔ اس شعر میں اس آیت کی طرف تلمیح ہے: اِنْ نُّشَا نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آیَةً فَظَلَّتْ
اَعْنَآ قُلُوبُہُمْ لَمَّا خَاضِعِیْنَ (اگر ہم چاہیں تو ان (مشرکوں کے ماننے والوں) پر آسمان سے نشانی اتار دیں پھر ان کی
مگر ذہن اس تک آگے جھک جائیں)

پھر سے ان اوراق کو ترتیب دے
عاشقوں کو اپنے پھر مجبور کر
پھر روؤں کو منزل تسلیم بخش
قوت ایمانِ ابراہیم بخش
عشق کا ہو منزل لا سے گزر
ہم پہ وا پھر راہِ الا اللہ کر

میں کہ روتا ہوں زمانے کے لیے
دے مجھے یارب وہ اشکِ دلفروز
جس کو بوؤں تو اگلیں شعلوں کے بن
آنکھ مستقبل پہ، دل ماضی میں مست
”جو بزمِ غم خود ہمارا یار ہے
اس جہاں میں ہے کہاں میرا ہمراہ
پناہینا کر لیا میں نے وبال
جس سے غارت ہے مرا سامانِ ہوش
علم کو جس نے کیا خوار و زبوں
مہر جس کے سوز سے آتشِ لباس
مثلِ شبنم دل بہت گریاں ہوا
شمع کو جلتا سکھا کر بر ملا
ہر جن مو سے مرے شعلے اُگے
کر کے پیدا نغمہ آتشِ مزاج
ہے زمانہ میرا خالی سوز سے
پر اکیلا جل کے کچھ حاصل نہیں
رازِ داں میرا نہ کوئی غمگسار

اہلِ محفل کو ملانے کے لیے
بیقرار و مضطرب و آرام سوز
جس سے لالہ بھی ہوا آتشِ پیرہن
بزم میں تنہا ہوں جامِ جم بدست
وہ بھی کیا پائے ہمیں لاچار ہے
نخل سینا ہوں تو دے میرا کلیم
ایک شعلہ دل میں رکھا ہے سنبھال
جل رہا ہے دمِ دامنِ ہوش
جس سے سیکھے عقلِ آداب جنوں
بجلیاں پھرتی ہیں جس کے آس پاس
تب امینِ شعلہ پنہاں ہوا
اس قدر چھپ چھپ کے دل جلتا رہا
جن سے بلبل نے شرارے چن لیے
میرے دم سے خوشنوا بلبل ہے آج
میں ہوں سوزاں اس غمِ دلِ دوزخ سے
کوئی پروانہ مرے قابل نہیں
میں کروں کب تک کسی کا انتظار

اب سہا جاتا نہیں بس! اے خدا
 چھین لے اپنی امانت چھین لے
 یا مجھے اک ہمدِ دلدار دے
 موج ہے دریا میں ہم پہلوئے موج
 ہر ستارہ اپنے ہمدِ کے قریب
 دن بھی ہم پہلوئے شب ہے وقتِ ثا
 ڈوبتی ہے آبِ جو میں آبِ جو
 رقص میں ہر ذرۂ دیرانہ ہے
 ہو کے یکتا تو نے بھی تو اے خدا
 دیکھ مجھ کو، لالہ صحرایوں میں
 مجھ کو بھی یارب ہو اک ہمدِ نصیب
 ایسا دیوانہ جو فرزانہ بھی ہو
 اپنی 'ہو' دے کر اسے اپناؤں میں
 اپنا شعلہ لے لے واپس اے خدا
 دل سے احساسِ ندامت چھین لے
 جس پہ دل میرا یہ سب کچھ وار دے
 کھیلنا ہم جولیوں سے خوئے موج
 چاند کو بھی شب کا پہلو ہے نصیب
 سینۂ امروز ہے فردا مقام
 بو میں گم ہو کر ہوا ہے مشکبو
 رقص میں دیوانہ بادیوانہ ہے
 یہ جہاں اپنے لیے پیدا کیا
 ہے بھری محفل مگر تنہا ہوں میں
 جو ہمیشہ ہو مرے دل کے قریب
 فکرِ این و آن سے بیگانہ بھی ہو
 دل کے آئینے میں اس کو پاؤں میں

پھر مری مٹی سے اک پیکر بنے
 جس کا میں اور جو مرا آزر بنے



کسی قوم کی متاع بے بہا مادے کے وہ بھاری بھر کم تو دے نہیں ہوتے، جو اس کی سرزمین کے طول و عرض میں کارخانوں، آبى بند، نہروں، جھیلوں اور مادی ترقیات کے منصوبوں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ وہ عالی دماغ افراد اور ان کے علمی، فکری اور تخلیقی کارنامے ہوتے ہیں جو قوم کے وجود معنوی میں نوبہ نو زندگی کی لہریں بن بن کر دوڑتے اور اسے زندہ و پائندہ رکھتے ہیں۔ معاشی وسائل کا کسی قوم کے وجود ملی میں وہی مقام ہے جو جسم میں پیٹ کا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ فکری تخلیقات کا منبع جسم انسانی میں بلند ترین مقام پر رکھا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اقدار کا شاعر ہے۔ ابدی حقیقتوں کا علم بردار ہے۔ وہ قدریں جو دل و دماغ اور روح میں پرورش پاتی ہیں۔ عقیدے کی پتھاریوں سے جنم لیتی ہیں۔ اور بدن کے کپڑوں کی طرح نہ پھٹتی ہیں، نہ میلی اور پرانی ہوتی ہیں۔ وہ چاند سورج اور ستاروں کی طرح روشن، بلند اور ابدی وجود رکھتی ہیں۔ نئے اور پرانے کی تقسیم کو اقبال خود دلیل کم نظری قرار دیتا ہے۔ علامہ اقبال کی یہ سب سے پہلی شعری تصنیف ”اسرار خودی“ ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ شائع ہوتے ہی یہ مثنوی برصغیر کے اہل علم و تصوف کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کا سبب ”اسرار خودی“ کا موضوع اور علامہ اقبال کے مجتہدانہ خیالات تھے تاہم اس وقت کسی شخص کو بھی اسے اردو میں منتقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ غالباً اس لیے کہ اس وقت فارسی علمی زبان تھی اور قریب قریب ہر تعلیم یافتہ شخص اسے باسانی سمجھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر نکلسن وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ”اسرار خودی“ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہی علامہ اقبال کی کسی تصنیف کا کسی زبان میں پہلا ترجمہ تھا اور تراجم اقبال کے اس سلسلے کا آغاز بھی اس کتاب کے ترجمے سے بھی ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید نے اردو ترجمے کے لیے علامہ اقبال کی شہرہ آفاق مثنوی اسرار خودی کا انتخاب کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ مثنوی علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کو بیان کرنے کے لیے ان کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے۔ پھر اسی اسرار خودی کی لے آگے بڑھ کر ان کے سارے کلام اور فلسفہ زندگی میں رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اپنے منظوم ترجمے عکس اسرار خودی میں علامہ اقبال کی اس با مقصد مقدس خواہش کا سب سے زیادہ احترام کیا ہے اسی لیے ان کے منظوم ترجمے نے ایک ایسے خلا کو پُر کیا ہے جو علامہ اقبال کی تخلیق اسرار خودی کا مقصود تھا۔